سہ ماہی مجلہ بحث ونظر حیدرآباد

شمارہ نمبر : ۱۲۵-۱۲۶ / ۲۵-۲۶	جولائی — دسمبر ۲۰۲۱ء	ذی الحجہ ۱۴۴۲ھ — جمادی الاول ۱۴۴۳ھ

زرِتعاون

اندرون ملک	بیرونِ ملک
ایک شمارہ:50 روپے	ایشیائی ممالک کیلئے سالانہ:20امریکی ڈالر
سالانہ:180، بذریعہ رجسٹری:220	یورپ، امریکہ، افریقہ کے لئے :
سہ سالہ:500، بذریعہ رجسٹری:600	سالانہ:30امریکی ڈالر

ترسیل زر اور خط وکتابت کا پتہ

Khalid Saifullah Rahmani, Baitul Hamd, H.No:16-182/1, Quba Colony,
Po:Pahadi Shareef, Hyd. T.S 500005, Ph: 9989709240 E-mail: ksrahmani@yahoo.com

چیک / ڈرافٹ پر صرف:"Khalid Saifullah" لکھیں

کمپیوٹر کتابت: مولانا محمد نصیر عالم سبیلی ''العالم'' اُردو کمپیوٹرس، حیدرآباد، فون نمبر:9959897621

فہرست مضامین

● ● ●

بسم اللہ الرحمن الرحیم

افتتاحیہ

سہ ماہی مجلہ بحث ونظر کا (شمارہ نمبر: ۲۵-۲۶) آن لائن ذریعہ سے قارئین کی خدمت میں حاضر ہے، لاک ڈاؤن اور پھر کورونا نے ادارہ پر جو اثر ڈالا اس کے تحت تاخیر کے ساتھ اور آن لائن یہ شمارہ شائع کیا جارہا ہے، اور شاید اس کے بعد کا شمارہ بھی اسی طرح شائع ہو، دُعا کریں کہ اللہ تعالیٰ اس کے بعد معمول کے مطابق اس علمی وتحقیقی رسالہ کی طباعت کو آسان فرمادے، واللہ ہو المستعان۔

زیر نظر شمارہ میں فقہی، تحقیقی، وتعارف کتب اور علمی شخصیات کے تذکرہ سے متعلق مضامین شامل ہیں ،صبح صادق سے متعدد شرعی احکام متعلق ہیں، اس پر ایک تفصیلی اور قیمتی مضمون شامل ہے، مدارس اس وقت نازک صورتِ حال سے گزر رہے ہیں ان کے مالی اور معاشی مسائل پر مقالہ آپ کے سامنے ہے، فتاویٰ ہندیہ فقہ حنفی کی جزئیات کا گویا بحر ناپیدا کنار ہے، اس کے اہم مصادر جو ابھی مخطوطات کی شکل میں ہیں، پر بصیرت مندانہ گفتگو ہے، ایک بڑا اہم مضمون اس موضوع پر ہے کہ محدثین اور فقہاء کا دائرۂ علم وتحقیق کیا ہے، حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی اس صدی کے ممتاز محدث تھے؛ لیکن اس کے ساتھ ساتھ فقہ وفتاویٰ میں بھی اونچا درجہ رکھتے تھے، اس پس منظر میں علامہ اعظمیؒ کی فقہی تالیفات کا تعارف کرایا گیا ہے۔

ماضی قریب میں جن شخصیتوں سے علمی دنیا محروم ہوئی، ان میں ایک اہم نام حضرت مولانا نور عالم خلیل امینیؒ کا ہے اور گذشتہ صدی کی اہم اصلاحی شخصیات میں ایک روشن نام حضرت مولانا عبدالرحیم مجددیؒ کا ہے، ان دونوں بزرگوں پر راقم الحروف کے قلم سے مختصر سوانحی اور تاثراتی تحریریں '' گاہے گاہے بازخواں

ایں قصہ پارینہ را'' مصداق شامل مجلہ ہیں اور المعہد العالی الاسلامی سے جو فتاویٰ جاری کئے جاتے ہیں، ان میں سے چند اس شمارہ میں شامل کئے گئے ہیں۔

دُعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو قبول فرمائے اور اہل ذوق کے درمیان اسے پذیرائی حاصل ہو۔

وباللہ التوفیق وہو المستعان

خالد سیف اللہ رحمانی

(بیت الحمد، شاہین نگر، حیدرآباد)

۱۷ر ربیع الثانی ۱۴۴۴ھ

۱۲ر نومبر ۲۰۲۲ء

• • •

طلوع صبح صادق کی جدید تحقیق کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ

مولانا محمد کوثر امام اشرفی
(سمری بختیار پور، سہرسہ، بہار)

شریعت اسلامی نے نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج اور عدتِ طلاق ووفات وغیرہ کے لئے اوقات مقرر فرمائے ہیں، طلوعِ صبح صادق وطلوعِ شمس وغروب، شفق، نصف النہار، دن، مہینے اور سال ان سب کے ادراک کا مدار رؤیت ومشاہدہ پر رکھا ہے، نہ کہ کسی حساب یا عقلی قانون پر، مذکورہ تمام چیزوں کے اوقات کا ادراک رؤیت ومشاہدہ کے بغیر ممکن نہیں تھا جو شریعت عامہ تامہ کے لائق شان بھی تھا، نیز ان تمام احکام کی بجا آوری کے لئے پوری دنیا کے لوگوں کو درجات ودقائق اور محاسبات بینات وزیج کی تکلیف بھی نہیں دی جاسکتی تھی، اللہ تعالیٰ ان تمام اوقات کے ادراک کے لئے دو کھلی نشانیاں سورج اور چاند مقرر فرمادیں؛ تاکہ سورج اور چاند کے اختلافِ احوال کو دیکھ کر خاص وعام سارے لوگ اوقاتِ مطلوبہ کا بآسانی ادراک کرسکیں، قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

> ہم نے رات اور دن کو بطور نشانی بنایا ہے، رات کی نشانی کو بے نور اور دن کی نشانی کو روشن؛ تاکہ اپنے رب کی (عطا کردہ) روزی کو تلاش کرو اور سالوں (کے مہینوں) کی گنتی اور (مہینوں کی تاریخ کا) حساب معلوم کرلو اور ہم نے ہر چیز کو کھول کھول کر بیان کردیا ہے! دوسری جگہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: (اے محمد!) لوگ آپ سے چاند کے متعلق دریافت کرتے ہیں؟ آپ کہہ دیجئے کہ یہ لوگوں کے لئے اوقات کے جاننے کا اور بالخصوص حج کے ایام کو پہچاننے کا ذریعہ ہیں۔

اسی طرح ایک جگہ وقتِ سحر سے متعلق ارشاد ہے :

> جب تک صبح کی سفیدی (صبح صادق) رات کی سیاہی (صبح کاذب) سے نمایاں نہ ہوجائے، کھاؤ پیو۔

ان سب میں بعض احکام کا مدار تو صرف رؤیت ہی پر ہے جو رؤیتِ ہلال سے متعلق ہے، جیسے روزۂ رمضان، عیدالفطر وعیدالاضحیٰ اور عدتِ طلاق ووفات وغیرہ اور باقی وہ ہیں جن کا اصل مدار تو رؤیت ہی پر تھا، مگر رؤیت ہی کے تکرر سے تجربہ کے ذریعہ علماء ہیئت وتوقیت کو ان اوقات کے ادراک کا قاعدہ کلیہ بنانا میسر ہو سکا اور علم ہیئت وزیچ کا ایسا ضابطہ بنایا کہ اس کے دریعہ ہم پیش از وقت ان مطلوبہ اوقات کو جان سکتے ہیں کہ فلاں وقت اتنے گھنٹے، اتنے منٹ وسکنڈ پر واقع ہوگا۔

علماء فن کا بنایا ہوا یہ حساب کبھی خطا نہیں کرے گا، اس لئے کہ ان تمام رؤیتوں ومشاہدوں کا مدار شمس وقمر کی چال پر موقوف ہے، سورۂ رحمان میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

سورج اور چاند (اللہ کے مقرر کردہ) ایک حساب کے پابند ہیں۔

اسی طرح سورۂ یٰسین میں ارشاد باری تعالیٰ ہے :

اور سورج اپنے ٹھکانے کی طرف چلا جارہا ہے، یہ اس بڑے طاقتور اور بڑی ہی باخبر ذات کا مقرر کردہ نظام ہے، چاند کے لئے بھی ہم نے منزلیں مقرر کردیں، یہاں تک کہ وہ سوکھی ہوئی پرانی ٹہنی کی طرح ہوجاتا ہے، (میرے مقرر کردہ حساب کا حال یہ ہے کہ) نہ سورج کی مجال ہے کہ وہ چاند کو پکڑ لے اور نہ رات دن سے پہلے آسکتی ہے، سب کے سب (اپنے طریق پر) ایک مدار میں تیر رہے ہیں۔

یہ تمام حسابات تو روزِ اول سے قطعی تھے ہی، مگر جن چیزوں کا ادراک انسانی علم کے اعتبار سے ایک مشکل امر تھا وہ رؤیت کے تکرر اور تجربات کے ذریعہ اتنا آسان ہوگیا کہ اب ہم تجربات وحسابات دونوں کے توسط سے قطعی حکم لگا لیتے ہیں کہ کسی بھی شہر کے عرض البلد اور میلِ شمس کے ذریعہ وہاں کے اوقاتِ پنج گانہ اور سحر وافطار بآسانی معلوم کرلیتے ہیں۔

ان دنوں صبح صادق کے معاملہ میں متقدمین علمائے ہیئت کی ہیئتی زبان اور ان کے گنجلک جملوں سے غیر ہیئت داں علماء میں جو غلط فہمی پیدا ہورہی ہے، اس سے زیادہ ان دنوں صاحب احسن الفتاویٰ محترم مفتی رشید احمد صاحب کے رسالہ ''صبح صادق'' کی عبارتوں سے ہونے لگی ہے، مفتی صاحب موصوف نے اپنے عقلی دلائل سے مفتی شفیع عثمانی صاحب، مولانا یوسف بنوری صاحب رحمہما اللہ اور مفتی تقی عثمانی صاحب وغیرہم جیسے تمام

علمائے پاکستان کومکمل طور سے باور کرادیا کہ جدید تحقیق کے مطابق صبح صادق کا اصل وقت اس وقت ہوتا ہے جب آفتاب ۱۵ درجہ زیر اُفق ہوتا ہے؛ چنانچہ ان کی باتوں پر یقین کرتے ہوئے مفتی شفیع صاحبؒ نے ۲۸/ذوالقعدہ ۱۳۹۰ھ میں فتویٰ بھی صادر فرمادیا جو ''احسن الفتاویٰ'' میں مرقوم ہے، اس فتویٰ میں مفتی شفیع صاحب تحریر فرماتے ہیں:

> اتنی بات تو یقینی ہوگئی کہ نقشوں اور جنتریوں میں جو وقت صبح صادق کا لکھا ہے وہ صبح صادق کا اصل وقت نہیں ہے؛ بلکہ غالباً صبح کاذب کا وقت ہے جو انتہاء سحر کے لئے احتیاطاً لکھا گیا ہے، اس کے بعد بھی کچھ وقت رہتا ہے جس کی مقدار ہر جگہ ۱۲ منٹ ہی نہیں؛ بلکہ ہر موسم اور ہر علاقہ میں تفاوت کی نوعیت الگ ہے؛ لہٰذا نقشوں کے مطابق فوراً اذان دے کر مرد یا عورتوں کا نماز پڑھ لینا درست نہیں، نقشوں کے وقت سے بیس منٹ بعد فجر کی اذان دینے اور اس کے بعد نماز پڑھنے سے ہر موسم میں بلاشبہ نماز صحیح ہوجائے گی؛ لہٰذا اس پر عمل کیا جائے۔(۱)

مسئلہ کی نزاکت کے پیش نظر مفتی رشید احمد صاحب نے مفتی شفیع صاحبؒ سے صرف فتویٰ لینے پر ہی اکتفا نہیں کیا؛ بلکہ اس مسئلہ کو دارالعلوم کراچی، مدرسہ عربیہ نیوٹاؤن اور دارالافتاء والارشاد کی مشترک مجلس تحقیق میں پیش کیا جس پر تحقیق وتنقیح کے لئے مؤرخہ: ۱۳/ذوالقعدہ ۱۳۹۲ھ کو دارالعلوم کراچی میں مجلس تحقیق کی مجلس منعقد ہوئی، اس میں پوری تنقیح وتحقیق کے بعد اس مجلس کے اراکین نے بھی وقوعِ صبح صادق سے متعلق مفتی رشید احمد صاحب کی دلیل ''۱۵/درجہ زیر اُفق آفتاب کے وقت'' کی تائید وتوثیق کردی اور پھر اسے عوام میں عام کردیا گیا، مذکورہ مجلس تحقیق کا پاس کردہ توثیقی مضمون درج ذیل ہے:

> اس مجلس میں حضرت مولانا مفتی رشید احمد صاحب کے رسالہ ''صبح صادق'' کے دلائل پر غور کیا گیا اور متعلقہ کتب کی مراجعت کی گئی، نیز مسئلہ کی تحقیق اور مشاہدات کے لئے ٹنڈوآدم کا جو سفر کیا گیا تھا اس کے نتائج زیر غور آئے، بحث وتمحیص کے بعد مندرجہ ذیل باتیں پایۂ ثبوت کو پہنچ گئیں۔

---

(۱) احسن الفتاویٰ: ۲/۱۷۷۔

مسئلہ کے زیرغور آنے کے بعد متفرق ایام میں جتنے مشاہدے کئے گئے ان میں کسی بھی مروجہ جنتریوں کے مطابق صبح صادق نہیں ہوئی؛ بلکہ اس کے بعد ہوئی۔

ان سب اُمور سے ثابت ہوتا ہے کہ مروجہ جنتریوں میں صبح صادق کے نام سے جو وقت لکھا گیا ہے وہ درحقیقت صبح کاذب کا ہے، حضرت مولانا مفتی رشید احمد صاحب نے صبح صادق کے جو اقات نکالے ہیں ان کا مقابلہ ٹنڈو آدم کے مشاہدات سے کیا گیا ہے، فرق صرف ایک منٹ کا تھا۔

بہر کیف! مذکورہ بالا تحقیق سے ہمیں بھی یہ ظن غالب ہوتا ہے کہ مفتی رشید احمد صاحب نے حسابی طریقہ سے جو اوقات نکالے ہیں وہ درست ہیں۔(۱)

اس توثیقی مضمون پر سرفہرست پہلا دستخط مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہ العالی کا ہے، پھر حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ اور مولانا عاشق الٰہی صاحبؒ کا اور آخر میں مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب دامت برکاتہم کا۔

ان علمائے کرام کی مذکورہ تائید وتوثیق کو دیکھتے ہوئے جہاں پاکستان کے چند علماء حضرات اس جدید تحقیق پر آج تک عمل کئے جارہے ہیں وہیں ہندوستان کے بھی چند مفتیان کرام نے مفتی رشید احمد صاحب کی پیروی کرتے ہوئے ۱۵ درجہ انحطاط شمس کے وقت کو تسلیم کرتے ہوئے وقوعِ صبح صادق کا فتویٰ دینا شروع کردیا تھا، ایک دن دارالعلوم (وقف) دیوبند کے استاذ اور میرے عزیز مفتی نوشاد نوری صاحب نے مجھے فون کیا کہ ہمارے دارالعلوم کے مفتی صاحب نے فتویٰ دیا ہے کہ صبح صادق کا صحیح وقت ۱۵ درجہ انحطاط شمس کے وقت ہی ہوتا ہے، کیا یہ صحیح جواب ہے؟ میں نے پوچھا کہ وہ ۱۵ درجہ کو کیا سمجھتے ہیں؟ ۱۸ درجہ انحطاط شمس کے اعتبار سے تخریج کئے ہوئے جو اوقات صبح صادق کے ہیں اس سے یہ اوقات پہلے ہوں گے یا بعد میں؟ میرے سوال پر جواب دینے والے مفتی صاحب نے لاعلمی کا اظہار کرتے ہوئے جواب دیا کہ میں تو علم ہیئت سے واقف نہیں ہوں، اس علم کے ماہر صاحب احسن الفتاویٰ مفتی رشید احمد صاحب کا فتویٰ چوں کہ یہی ہے اور اسی کے مطابق مدرسہ شاہی مرادآباد کے مفتیان کرام بھی فتویٰ دیتے ہیں، اس لئے میں نے بھی یہی فتویٰ دیا، میں نے ان سے کہا کہ جس احسن الفتاویٰ کی آپ بات کررہے ہیں اس کے مطابق مفتی شفیع صاحب نے بھی پہلے ۱۵ درجہ

---

(۱) احسن الفتاویٰ: ۲/ ۱۷۸۔

انحطاطِ شمس کے وقت ہی صبح صادق کے وقوع کا فتویٰ دیا تھا، مگر پھر بعد میں انھوں نے اس فتویٰ سے رُجوع بھی کرلیا تھا، آپ لوگ پوری کتاب پڑھیے، خیر! اللہ کا شکر ہے کہ مفتی صاحبان کی سمجھ میں بات آ گئی، کل مفتی نوشاد سلمہ نے دوران ملاقات بتایا کہ اب مدرسہ شاہی مرادآباد کے مفتیان کرام نے مفتی سلمان منصور پوری صاحب مدظلہ العالی کے ایما پر ۱۸ درجہ انحطاط شمس کے وقت ہی کو صبح صادق کو تسلیم کرلیا ہے اور اب ہمارے دارالعلوم (وقف) دیوبند کے مفتی صاحب بھی اسی کے مطابق فتویٰ دینے لگے ہیں، خدا کرے کہ ان علمائے پاکستان کو بھی صحیح سمجھ آجائے جو وقوعِ صبح صادق کے لئے ۱۵ درجہ زیر اُفق آفتاب کے وقت کی بے جا وکالت کر رہے ہیں، حال آں کہ علم ہیئت سے نابلد ان علمائے کرام کو علم ہیئت کے اس نکتہ کا قطعاً علم نہیں ہے کہ علم ہیئت کے اعتبار ہمارے دیار میں ۱۵ درجہ انحطاط شمس کے وقت صبح صادق کبھی ہو ہی نہیں سکتی، ۱۵ درجہ زیر اُفق صبح صادق وہاں ہوگی جہاں کا طولِ شب از غروب تا طلوع آفتاب ۱۴ گھنٹے سے زائد پورے سال یا اکثر ماہ رہتا ہو؛ جب کہ ہمارے ہندوستان بہ شمول پاکستان (از: ٦ درجہ عرض تا ٣٦ درجہ عرض البلد) میں کہیں بھی پورے سال چودہ گھنٹے کی رات کسی موسم میں نہیں ہوتی؛ البتہ ٣٦ درجہ عرض البلد کشمیر کے شمالی علاقے میں ہیئتی رو سے تقریباً ڈیڑھ ماہ سے کچھ زائد یعنی ۲۶ نومبر تا ۱۷ جنوری چودہ گھنٹے کی رات ہوتی ہے، اس سے زیادہ کبھی نہیں، ان ہی چند نکات کی معلومات کے بعد پاکستانی مجلس تحقیق کے ذمہ دار علماء نے کچھ دنوں بعد ہی اپنے اپنے فتوے سے رُجوع فرمالیا تھا۔

یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ بعض اربابِ افتاء صبح صادق سے صرف تین ہی درجے قبل انحطاط شمس کے وقت کو صبح کاذب مانتے ہیں جو غلط ہے، ہمارے دیار میں یہ فارمولہ شاید پورے سال میں کسی دن بھی ثابت نہیں ہوتا ہوگا، میں نے اس کا پورا اہتمام تو کبھی نہیں کیا اور نہ اسلامی شریعت کا کوئی حکم اس سے متعلق ہے، تاہم جب کبھی بھی اتفاقاً غور کیا تو ہمیشہ صبح صادق سے کم از کم سات آٹھ درجے قبل ہی صبح کاذب کی روشنی کو پایا، ابھی کل کی بات ہے، ۷ر جنوری ۲۰۲۱ء، مطابق: ۲۲ر جمادی الاولیٰ کو ہمارے شہر سہرسہ میں وقت صبح صادق میرے ''معیار الاوقات'' میں درج اوقات کے اعتبار سے ۵ بج کر ۱۰ منٹ تھا، میں نے اپنے گھر کی ہر چہار جانب بھر کی تمام بجلیاں گل کر کے اپنی چھت کی دوسری منزل پر جا کر پونے پانچ بجے معائنہ کیا تو بستی میں بجلی کی چکا چوندھ روشنی کے باوجود صبح کاذب بہت واضح طور پر نمودار تھی، ایسا گمان ہوتا تھا کہ پانچ سات منٹ قبل ہی نمودار ہوئی ہوگی، پھر آج ۸ر جنوری، مطابق ۲۳ر جمادی الاولیٰ کو صبح صادق کا وقت ۵ بج کر ۱۱ منٹ ہے، آج

میں نے پونے ۳ بجے ہی اوپر جا کر معائنہ کیا، اس وقت شب کی سیاہی چھائی ہوئی تھی، اس وقت چاند اپنی منزل کے سعد بلع (اُردو نام بلعہ ہندی دھنشٹا) کو طے کر رہا تھا، پھر میں نے ۴ بج کر ۳۱ منٹ پر دوبارہ جا کر دیکھا تو آبادی کے درمیان بجلی کی جگ مگاہٹ کی وجہ سے صبح کاذب کی روشنی دکھائی نہیں دی، میں مستقل اوپر ہی کھڑا رہا، چار بج کر اڑتیس سے چالیس منٹ کے درمیان صبح کاذب کی وہ سرخی مائل ''مستطیل روشنی'' دکھائی دینے لگی جو چاند کی بلندی سے کچھ اوپر ثریا کے قریب تک نظر آ رہی تھی، اس وقت محاسبۂ علم ہیئت کے مطابق آفتاب تقریباً ۲۶ درجہ اُفق سے نیچے تھا، یہ روشنی ۴ بج کر ۵۵، ۵۶ منٹ سے مدھم ہونے لگی اور ۵ بج کر ۵، ۶ منٹ تک میں وہ سرخی مائل روشنی غائب ہوتی چلی گئی، مگر کہرا کی دھند، ہوائے غلیظ اور بخارات کی وجہ سے صبح صادق والی ''ضوء مستطیر'' کی ابتدا کا پتہ نہیں چل سکا اور نہ اس زمانے میں اس کی اُمید بھی کی جا سکتی ہے؛ کیوں کہ شہر اور بازار کیا، کہ دیہات اور گاؤں کی گلی تک میں بجلی کی جگ مگاہٹ کی وجہ سے فضائی آثار و کیفیات متاثر رہتے ہیں؛ لیکن اتنی بات تو یقینی ہے کہ صبح کاذب اور صادق کے درمیان بہ اختلاف موسم تین درجے سے بہت زیادہ فاصلہ ہوتا ہے نہ کہ تین ہی درجے۔

مختصر یہ کہ مفتی رشید احمد صاحب کی تحریروں سے صاف عیاں ہے کہ موصوف نے صبح کاذب وصادق کی شناخت میں خود بھی دھوکہ کھایا اور دوسرے معتمد علماء کو بھی غلط فہمی میں ڈال دیا، ان ہی سب حقیقتوں کا علم ہونے کے بعد حضرت مولانا یوسف بنوری صاحبؒ ۲ رمضان المبارک ۱۳۹۳ھ کو اپنے فتویٰ سے رُجوع فرماتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں :

> کچھ عرصہ سے کراچی اور چند اور شہروں میں نماز فجر اور سحری کے اوقات کے مختلف نقشے سامنے آئے جس کی وجہ سے عوام خاصے پریشانی میں مبتلا ہو گئے کہ کس پر عمل کریں اور کس کو صحیح سمجھیں، اس وقت چوں کہ پوری تحقیق کا موقع نہ مل سکا تھا، اس لئے احتیاطاً یہی فتویٰ دیا گیا کہ نماز کے لئے ان نقشوں پر عمل کیا جائے کہ جن میں صبح صادق کا وقت بعد تک ہے اور انتہائے سحری کا وقت ان سے لیا جائے جن میں وقت پہلے ختم ہوتا ہے؛ لیکن بعد میں بعض مخلصین کی کوشش سے جو معلومات حاصل ہوئیں ان سے یہ بات پایۂ تحقیق کو پہنچی کہ تمام نقشوں میں وہی سابق کراچی کا نقشہ جس کو مرحوم حضرت حاجی وجیہہ الدین صاحب

خان بہادر نے مرتب کیا تھا اور چھاپا تھا وہ بالکل صحیح ہے، ہاں جس کا جی چاہے نماز دیر سے پڑھے؛ تاکہ اس کو بھی یقین ہوجائے کہ وقت ہوگیا ہے تو اور اچھا ہے، دین کی بات میں ضد کی حاجت نہیں، جو بات صحیح ہو اور اس کو ماننا اور غلط بات سے رُجوع کرنا یہ عین دین کی بات ہے۔

اسی طرح مجلس تحقیق کے دوسرے رکن حضرت مولانا مفتی شفیع صاحبؒ بھی ان کے تقریباً چار ماہ بعد ۲۴رذوالحجہ ۱۳۹۳ھ کو اپنے فتویٰ سے رُجوع فرماتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں :

۱۳۶۸ھ اور ۱۹۴۸ء میں جب احقر پاکستان کراچی میں آکر مقیم ہوا تو یہاں کی عام مساجد وغیرہ میں اوقات کی ایک جنتری طبع کردہ حضرت حاجی وجیہہ صاحب مہاجر مدنیؒ آویزاں دیکھی اور بہت سے قابل اعتماد حضرات سے معلوم ہوا کہ انھوں نے اس جنتری کے طلوع وغروب کو مختلف مقامات پر مختلف زمانوں میں جانچا ہے اور صحیح پایا ہے، خود بھی جب کبھی جانچنے کا موقع ملا تو اس کے طلوع وغروب کو صحیح پایا، اس لئے دوسرے اوقات کے معاملہ میں بھی اسی پر اعتماد کیا گیا۔

اب سے چند سال پہلے اپنے احباب میں سے بعض اہل علم نے کچھ نئی تحقیق کرکے یہ قرار دیا کہ اس جنتری میں جو وقت صبح صادق کا دیا گیا ہے درحقیقت وہ صبح کاذب کا ہے اور اس پر چند جدید وقدیم کے کچھ اہل فن کے اقوال بھی پیش کئے، چوں کہ یہ احتمال غالب تھا کہ نئے اہل فن نے وہ صبح کاذب اور صادق میں فرق نہ کرکے کاذب ہی کو صبح کہہ دیا ہو اس لئے مجھے بھی صبح صادق کے معاملہ میں تردد ہوگیا، اسی بنا پر ہر رمضان میں نقشہ اوقات کے ساتھ یہ نوٹ شائع کرنا شروع کیا کہ سحری کا کھانا تو قدیم جنتری کے وقت پر ختم کردیا جائے، مگر صبح کی نماز اس کے بعد پندرہ بیس منٹ انتظار کے بعد پڑھی جائے۔

سال رواں میں بعض اہل فن حضرات کے ساتھ بحث وتمحیص اور جدید فلکیات کی بعض کتابوں کی مراجعت سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ جدید ماہرین فلکیات نے خود صبح کاذب کو الگ کرکے بیان کیا ہے اور وہ درحقیقت رات کا

حصہ ہے، اس کے بعد جو صبح صادق ہوتی ہے اسی کو انھوں نے صبح کہا ہے، اس نئی تحقیق اور بحث سے میرا تردد رفع ہوگیا اور میں قدیم جنتری کے اوقات کو حسابی اعتبار سے صحیح سمجھتا ہوں؛ البتہ یہ حسابات خود یقینی نہیں ہوتے، نماز، روزہ کے معاملہ میں احتیاط ہی کا پہلو اختیار کرنا چاہئے۔(۱)

علمائے پاکستان کی مجلس تحقیق کے مضمون سے صاف عیاں ہے کہ مفتی رشید احمد صاحب کے علاوہ اس مجلس میں کسی اور کو علم ہیئت وتوقیت سے زیادہ مناسبت نہیں تھی، اور علم نجوم وغیرہ سے تو سب کے سب نابلد نہیں تو ناقص شناس ضرور تھے، علم ہیئت وتوقیت کا ماہر وہی شخص ہوسکتا ہے جس کو علم حساب اور علم جغرافیہ کے علاوہ علم نجوم وعلم مناظر میں بھی مہارت ہو، یہ انگریزوں کے انگریزی نام زوڈیکل لائٹ اور ایسٹرونومیکل ٹوئیلائٹ جو بھی بتایں، مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ زہرہ وثریا اور مریخ ومشتری کی بھی پوری شناخت نہیں رکھتے تھے۔

ملاحظہ فرمائیں احسن الفتاویٰ کی یہ عبارت :

دسمبر ۱۹۷۱ء میں پاک وہند کی جنگ کے دوران بلیک آؤٹ کی وجہ سے شہر کے اندر رہتے ہوئے مشاہدات کا بہتر موقع مل گیا، مجھے اس سے بہت حیرت ہوئی، صبح کاذب سے بہت پہلے مشرق کی طرف اور عشاء سے بہت بعد مغرب کی طرف مستطیل روشنی نظر آرہی ہے، میں نے اس عقدہ کو حل کرنے کا خاص اہتمام کیا، ۱۹؍دسمبر کی شام کو مغرب کے بعد جلد ہی میں نے اُفق غربی کا مراقبہ شروع کردیا، میں نے دیکھا کہ مغرب شمس سے قدرے جنوب کی طرف ایک غیر معمولی روشن سیارہ (زہرہ) ٹھیک اسی جگہ پر ہے جہاں پہلے روز عشاء کے بعد بھی روشنی نظر آرہی تھی، یہ سیارہ پونے آٹھ بجے غروب ہوگیا مگر اس کے اوپر مستطیل روشنی ساڑھے دس بجے تک واضح طور پر نظر آتی رہی، جب کہ اس روز ۱۵ درجہ زیر اُفق (وقت عشاء مقابل صبح صادق) کا وقت: ۶؍۵۵، اور ۱۸ درجہ زیر اُفق (مقابل صبح کاذب) کا وقت: ۷؍۹ ہے، اس کے بعد یوں محسوس ہونے لگا کہ اس مقام سے ثریا تک کہکشاں کی طرح مگر اس سے کافی مدھم سفید سڑک ہے۔

---

(۱) احسن الفتاویٰ: ۲؍۱۹۱۔

آگے مزید فرماتے ہیں :

۲۳ر دسمبر ساڑھے چار بجے اُٹھ کر دیکھا تو مشرق کی طرف مستطیل روشنی موجود تھی، ۲۴ر دسمبر کو میں نے رات کے تین بجے سے کام شروع کر دیا، مشاہدہ سے محسوس ہوا کہ مشرق کہکشاں کی طرح مگر اس سے کافی مدھم سفیدی اوپر کو جارہی ہے اور ثریا کی سیدھ میں معروف کہکشاں کے ساتھ مل رہی ہے، تقریباً ساڑھے چار بجے کے بعد مشرق کی طرف اس سفیدی میں کچھ اضافہ اور اوپر کی جانب کچھ کمی محسوس ہونے لگی اور وقت صبح کاذب تک یہی کیفیت رہی، صبح کاذب کی ابتدا کا کچھ احساس نہ ہوسکا، حسابی رو سے اس روز صبح کاذب کا وقت: ۵/۴۹ اور صبح صادق کا وقت: ۶/۶ ہے، ساڑھے چار بجے کے بعد روشنی میں اضافہ سے اندازہ ہوا کہ مغرب کی طرف اُفق شرقی کے نیچے بھی کوئی غیر معمولی روشن ستارہ اس کا باعث بن رہا ہے۔

آگے فرماتے ہیں :

نتیجہ یہ نکلا کہ معروف کہکشاں کے علاوہ ایک اور مدھم کہکشاں بھی ہے جس کے ساتھ بعض غیر معمولی روشن ستاروں کی روشنی بھی شامل ہوجاتی ہے جو مغالطہ کا باعث بنتی ہے۔(۱)

مفتی صاحب موصوف کو ایسے ہی جزائی مشاہدوں نے دھوکہ میں ڈالا ہے جو احسن الفتاویٰ کی مذکورہ عبارت سے صاف ظاہر ہو رہا ہے، مفتی صاحب موصوف نے جس ۲۴ر دسمبر ۱۹۷۱ء کو صبح صادق کا مشاہدہ کیا تھا تقویمی مدخل کے اعتبار سے اس دن ۱۳۹۱ھ کے ماہ ذیقعدہ کی ۶ تاریخ روز جمعہ تھا، اس شب میں چاند نے اپنی منازل کے ''الھنعہ'' منزل کو طے کیا تھا، (اُردو نام، ہنعہ، ہندی اُردرا) جب مفتی صاحب صبح صادق کی تحقیق ہی میں لگے ہوئے تھے تو اگر امام غزالیؒ کے تجربے کو کام میں لے آتے تو قوی اُمید تھی کہ وہ کامیاب ہوجاتے، صبح صادق کی شناخت سے متعلق امام غزالیؒ کا تجربہ آگے ملاحظہ فرمائیں۔

مختصر یہ کہ مفتی صاحب موصوف کی مذکورہ تحریر سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ انھیں علم ہیئت سے تو اچھا تعلق

(۱) احسن الفتاویٰ: ۲/ ۱۸۲-۱۸۳۔

ضرورتھا،مگرعلم نجوم سے مناسبت نہیں تھی اور اگر کچھ ہوگی بھی تو ناقص ،موصوف نے جدید وقدیم کچھ اہل فن کے اقوال دیکھ کرخلیل کاملی کی طرح خود بھی دھوکہ کھایا اور متدین علمائے کرام کو بھی غلط فہمی میں ڈال دیا ،نتیجہ کے طور پر ان علمائے کرام کو جب ان جدید ماہرین فلکیات کی حقیقت کا پتہ چلا تو دیانت دارانہ فرض منصبی نبھاتے ہوئے اپنے اپنے فتویٰ سے رُجوع فرمالیا۔

مفتی رشید احمد صاحب ۲۴ ردسمبر کو ساڑھے چار بجے اپنے مشاہدے میں جومحسوس کرتے رہے، وہ کچھ اور نہیں صبح کاذب ہی تھی جو سفید نہیں ، ہلکی سرخی مائل روشنی رہی ہوگی ، موصوف تو ہمیشہ یہی سمجھتے رہے کہ صبح کاذب صرف تین ہی درجے پہلے ،یعنی صبح صادق سے بارہ منٹ قبل نمودار ہوتی ہے، مگران کا یہ خیال باطل ہے، ہمارے دیار میں بہ شمول پاکستان از ٦ درجہ عرض تا ٣٦ درجہ عرض البلاد صبح کاذب سے صبح صادق کا وقفہ ہر موسم میں الگ الگ رہتا ہے، نہ کہ صرف تین ہی درجے، منجم خیر اللہ وحاجی وجیہہ الدین رحمہا اللہ، جیسے ماہرین توقیت کی جداول اوقات نماز، قیام پاکستان کے قبل سے ہی اس دیار کی مساجد میں آویزاں تھیں اور آج بھی ہیں ، ان بزرگوں نے بھی ۱۸ درجہ انحطاط شمس کے اعتبار سے یہی صبح صادق کی تخریج کی تھی جس پر آج تک لوگ عمل پیرا ہیں، ماہر علم توقیت ونجوم مولانا احمد رضا خان صاحبؒ اپنے رسالہ ''درء القبح عن درک وقت الصبح'' میں وقوع صبح صادق سے متعلق تحریر فرماتے ہیں :

> رؤیت شاہد عدل ہے کہ صبح کاذب کے وقت سترہ یا اٹھارہ یا انیس درجے اور صادق کے وقت ۱۵ درجے انحطاط ہونا اور صادق وکاذب میں صرف تین درجے کا تفاوت ہونا محض باطل ہے؛ بلکہ ۱۸ درجہ انحطاط پر صبح صادق ہوجاتی ہے اور اس سے بہت درجے پہلے صبح کاذب ،فقیر نے بچشم خود مشاہدہ کیا کہ محاسبات علم ہیئات سے آفتاب ہنوز ۳۳ درجے اُفق سے نیچا تھا اور صبح کاذب خوب روشن تھی صبح صادق کے سالہاسال سے فقیر کا ذاتی تجربہ ہے کہ اس کی ابتداء کے وقت ہمیشہ ہر موسم میں آفتاب ۱۸ ہی درجہ زیر اُفق پایا ہے اور صبح کاذب کے لئے جن سے کوئی حکم شرعی متعلق نہ تھا اب تک اہتمام کا موقع نہ ملا، ہاں اتنا اپنے مشاہدہ سے یقیناً معلوم ہوا کہ اس میں صبح صادق میں ۱۵ درجے سے بھی زائد فاصلہ ہے نہ کہ ۳ درجہ لاجرم۔(۱)

(۱) فتاویٰ رضویہ: ۶۴۶/۴۔

مولانا احمد رضا خان صاحب کے حالاتِ زندگی کو اگر آپ پڑھیں گے تو معلوم ہوگا کہ علم قرآن وحدیث کے علاوہ علم ہیئت اور اس کے متعلقات پر انھیں کافی عبور حاصل تھا، جماعتی عصبیت سے الگ ہوکر اگر آپ غور کریں گے تو ماننا پڑے گا کہ علم ہیئت وتوقیت کے علاوہ علم نجوم وغیرہ پر بھی انھیں اتنی مہارت تھی کہ وہ موسم اور بروج کے اعتبار سے دن میں سورج کی روشنی اور رات میں ستاروں کو دیکھ کر گھڑی ملایا کرتے تھے، مولانا نے صبح صادق کے موضوع پر ایک رسالہ بنام ''درءا القبح عن درک الصبح'' تحریر فرمایا تھا جو فتاویٰ رضویہ جلد چار میں شامل ہے، تشفی بخش تحقیق کے لئے یہ رسالہ بالاستیعاب اول تا آخر ضرور مطالعہ فرمائیں۔

نئے قارئین کے لئے قدیم زبان مشکل ہونے کی وجہ سے اس رسالہ سے استفادہ مشکل ہوسکتا ہے، ایسی صورت میں اسی صبح صادق کے موضوع پر حال ہی میں مولانا احمد رضا خان صاحبؒ کے شاگرد در شاگرد خواجہ مظفر حسین صاحب مرحوم پورنوی کے شاگرد رشید اور میرے مخلص ومحترم مفتی مطیع الرحمٰن رضوی صاحب دامت برکاتہم (بانی ومہتمم جامعہ نوریہ، شام پور، رائے گنج مغربی بنگال) نے بھی نہایت نکتہ سنجی اور دقت نظر کے ساتھ باتصویر ایک مدلل رسالہ بہ نام ''صبح وشفق'' تالیف فرمائی ہے، حقیقت پسند شائقین ومحققین کے لئے اس رسالہ کا مطالعہ بھی بے حد تشفی بخش ثابت ہوگا۔

صبح صادق کی صحیح شناخت کیلئے امام غزالیؒ کی قدیم تحقیق

فضائی کیفیات کے متاثر رہنے کی وجہ سے موجودہ دور میں اُفق کے آثار کے ذریعہ صبح صادق کی شناخت ایک دشوار امر ہے، صبح کاذب یا صادق کی صحیح ترین شناخت کے لئے لازم ہے کہ فضا معتدل ہو اور ابر و باد اور دھند وغیرہ سے مطلع بالکل صاف ہو، نیز بجلی کی چکا چوندھ فلک بوس جگ مگاہٹ سے بھی پاک ہو، چوں کہ بجلی کی فلک بوس جگ مگاہٹ بھی اُفق کے آثار کے معائنہ میں مخل ہوتی ہے، ابھی کے حالات یہ ہیں کہ مثل شہر و بازار، دیہات کی گلیوں تک کی جگ مگاہٹ نگاہ کو خیرہ کئے رہتی ہیں، موجودہ دور میں صبح صادق کی صحیح ترین شناخت کے لئے حضرت امام غزالیؒ کا قدیم ترین تجربہ ہی سب سے صحیح اور سہل ترین مشاہدہ ثابت ہوسکتا ہے، امام غزالیؒ اپنی معروف کتاب احیاء العلوم کی پہلی جلد ''کتاب اسرار الصلاۃ'' کے تحت ساتویں باب میں فرماتے ہیں :

> رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: فجر کی دو رکعتیں دنیا و مافیہا سے بہتر ہے، اس کا وقت
> طلوع صبح صادق کے ساتھ ہی شروع ہوجاتا ہے، اور وہ (اُفق کے کناروں پر)

> پھیلی ہوئی ہوتی ہے نہ کہ لمبائی میں ، شروع میں مشاہدہ کے ذریعہ اس (صبح صادق) کا ادراک دشوار ہوتا ہے؛ لیکن اگر منازل قمر کا علم ہو یا ان کواکب کے اقتران کا علم ہو جو طلوع صبح صادق کے نمودار ہونے کی نشان دہی کرنے والے ہیں، تو اس کا ادراک آسان ہے، چاند کے ذریعہ مہینے کی دو راتوں میں (صبح صادق) کو معلوم کیا جاسکتا ہے، مہینے کی چھبیس تاریخ کی شب، کہ (اس شب) طلوع صبح صادق کے ساتھ ہی چاند نمودار ہوتا ہے اور مہینے کی بارہ تاریخ کی شب ، کہ (اس شب میں) چاند کے غروب ہونے کے ساتھ ہی صبح صادق نمودار ہوتی ہے، عام طور پر ایسا ہی ہوتا ہے، کبھی بعضے بروج کے اختلاف طریق کی وجہ سے واضح فرق پڑ جاتا ہے۔

امام غزالیؒ کے اس محقق تجربہ کے ذریعہ صبح صادق کے سہل ترین مشاہدہ سے فی زمانہ کوئی دوسرا مشاہدہ نہیں ہوسکتا۔

●●●

علماء ومدارس کے معاشی مسائل، حقائق اور مشورے

مولانا محمد فرقان پالن پوری
(رفیق علمی شعبۂ تحقیق: المعہد العالی الاسلامی، حیدرآباد)

اسلامی تہذیب وثقافت کے امین و پاسباں

ایک مسلمان کے لیے یہ بات باعث صد افتخار ہے کہ اس کو اللہ تعالیٰ نے اسلام کی صورت میں ایک مکمل اور زندۂ جاوید دستور حیات مرحمت فرمایا ہے، مسلمانوں کا چودہ صدیوں پر محیط ایک شان دار اور درخشاں ماضی ہے، ان کے پاس ایک عظیم الشان تہذیب وثقافت ہے، قرآن وسنت کی شکل میں ان کے پاس واضح راہ نمائی موجود ہے، قرن اول سے لے کر عصر حاضر تک علمائے اسلام کی جہد مسلسل کے نتیجے میں فقہ اسلامی کی عظیم علمی میراث اور بے مثال دستور حیات کا ذخیرہ انہیں میسر ہے، یہ علماء ہی تھے اور ہیں کہ جنھوں نے دنیا کو ہدایت کی شاہراہوں پر چلایا اور مزاج شریعت سے روشناس کرایا، اور راہ نمائی سے روشناس کروایا، انھیں شرک، کفر اور جہالت کی اتھاہ گہرائیوں سے نکال کر ایمان وایقان اور علم کی روشنیوں سے مالا مال کیا، دنیائے انسانیت کو دستور حیات دیا، تہذیب دی، امن دیا، مظلوموں اور ناداروں سمیت تمام طبقات انسانی کو حقوق دیے، غرض انسانیت کو جینے کا سلیقہ اور قرینہ عطا کیا، مدارس دینیہ چوں کہ اسلام، اسلامی تہذیب وثقافت اور اُمتِ مسلمہ کی چودہ صدیوں کے عظیم الشان دینی اور علمی ورثہ کے امین ہیں، مدارس کی شبانہ روز محنتوں سے ہزار خرابیوں کے باوجود اسلام اپنے حقیقی روح کے ساتھ روئے زمین پر موجود ہے، یہ مدارس ہی ہیں جن کی جہد پیہم کی وجہ سے آج برصغیر پاک وہند استعماری طاقتوں کے سازشوں اور ریشہ دوانیوں کے باوجود ''اندلس'' نہیں بن سکا ہے۔

یہ اسلامی مدارس جو اس وقت کرہ ارض کے چپہ چپہ پر قائم ہیں، درحقیقت ان کا ربط وتعلق اس مدرسۂ صفہ سے ہے، جسے روئے زمین کا سب سے پہلے باقاعدہ قائم ہونے والا مدرسہ قرار دیا جاسکتا ہے، جس کے بانی ومؤسس، معلم مربی محسن انسانیت، شفیع المذنبین، محبوب رب العالمین، ذاتِ رسالت مآب ﷺ ہیں، اس نبوی

درسگاہ کے قدسی صفات طلبہ پیغمبر اسلام ﷺ کے مخصوص صحابہ کرام ہیں، جو سب سے زیادہ پاک دل، وسیع النظر، دریائے علم وتحقیق کے شناور، بے تکلف، شیریں بیاں، انسانیت کے بہی خواہ، سب سے زیادہ خدا ترس اور مقربین بارگاہِ الٰہی تھے۔

اُمتِ اسلامیہ پر مدارس کا احسانِ عظیم

جس طرح ایک انسان اپنی زندگی کی بقا کے لیے خوراک اور پوشاک کو ضروری خیال کرتا ہے، اسی طرح ایک حقیقی مسلمان اپنی اسلامی شناخت، تہذیبی خصوصیات، معاشرتی امتیازات سے وابستگی اور اپنے ملی وجود کی حفاظت کو اس سے کہیں بڑھ کر اہمیت دیتا ہے، وہ کسی قیمت پر اپنے ملی تشخص اور اپنے امتیازات وشعائر سے دستبردار نہیں ہوسکتا؛ چوں کہ خوراک سے پیٹ اور پوشاک سے جسم کی حفاظت تو ہوسکتی ہے؛ لیکن ایک حقیقی مسلمان کے پاس اس کے پیٹ اور جسم کے ان تقاضوں اور ان مادی ضرورتوں کے علاوہ بھی ایک اہم چیز اور بھی ہے، وہ ہے اس کا دین اور ایمان،

مسلمان بھوکا تو رہ سکتا ہے؛ لیکن وہ اپنی ایمانی اور تہذیبی خصوصیات سے دستبردار نہیں ہوسکتا، آج پوری دنیا میں مسلمانوں کو بحیثیت ایک ملت کے ختم کرنے کی کوشش کی جارہی ہے، آج ہمارا دشمن ہمارے ملی وجود اور تہذیبی خصوصیات کو چن چن کر ختم کرنے پر تلا ہوا ہے، اگر آج کی ۔۔۔؟ اور مختلف نظریات اور تہذیبوں کی بے اصل روایات وخرافات میں جکڑی ہوئی دنیا میں اسلام اگر کہیں ممکنہ حد تک اپنی تمام خصوصیات وامتیازات کے ساتھ نظر آرہا ہے، تو وہ انھیں دینی مدارس کی کوششوں کا نتیجہ ہے، شہر شہر، گلی گلی، قریہ قریہ، چھوٹی بڑی، کچی پکی جو مساجد جس حد تک بھی آباد نظر آرہی ہیں، مختلف تحریکوں کی شکل میں مسلمانوں کی اخلاقی واعتمادی اور معاشی اصلاح کا جو جال ہر سمت بچھا ہوا ہے، یا کسی بھی جگہ دین کی تھوڑی سی رمق اور چنگاری اگر نظر آرہی ہے وہ انھیں مدارس کا فیضِ اثر ہے، اگر ان مدارس کا وجود نہ ہوتا تو آج ہم موجود ہوتے؛ لیکن بحیثیت مسلم ہماری شناخت مٹ چکی ہوتی۔

ہندوستان میں عوامی چندے پر چلنے والے موجودہ شکل کے مدارس کی ابتدائی تحریک کا جائزہ لیجیے کہ کن اسباب ومحرکات کے تحت اس نظام کے مدارس کا آغاز ہوا، دراصل اُس وقت بھی یہی صورت حال تھی کہ مسلمانوں کے ہاتھوں سے زمامِ اقتدار چھن چکا تھا، انگریزی قوم یہاں کے ہر سیاہ وسفید کی مالک ہوچکی تھی، اگر انھیں مستقبل میں اپنے اور اپنے اس آمرانہ حکمرانی کے بیچ کوئی چیز سب سے بڑی رکاوٹ اور حائل نظر آرہی تھی

تو وہ یہاں کی غیور، باحمیت اور زندہ دل مسلمانوں کی تھی؛ چوں کہ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ مسلمانوں کو ان کی موجودہ خست وذلت سے نکال کر انھیں رفعت وبلندی کے اوجِ ثریا پر کوئی چیز پہنچا سکتی ہے تو وہ ہے ان کا ایمان وایقان اور ان کی دینی حمیت، انھوں نے اس کے لیے حکومت کے ماتحت چلنے والے تمام تعلیمی اداروں کے نصاب ونظام میں حذف واضافہ شروع کردیا، اس نصابِ تعلیم کی تبدیلی اور ترمیم کا راست اثر مسلمانوں کے ایمان وعقیدہ پر ہورہا تھا، وہ اپنی تہذیبی خصوصیات سے دستبردار ہوکر بحیثیت قومِ مسلم کے اپنا وجود کھو رہے تھے، اس وقت بھی مدارس ومکاتب کی اسی تحریک ہی کے ذریعہ اسلام کا بچاؤ ممکن ہوسکا۔

حکیم الامت حضرت مولانا تھانویؒ ان مدارس کے بارے میں یوں ارشاد فرماتے ہیں :

> ہم کو یہ صاف کہنا ہے کہ عربی مدرسوں کی جتنی ضرورت آج ہے، کل جب ہندوستان کی دوسری شکل ہوگی اس سے بڑھ کر ہوگی، یہ ہندوستان میں اسلام کی بنیاد اور مرکز ہوں گے، لوگ آج کی طرح کل بھی عہدوں اور ملازمتوں کے پھیر اور اربابِ اقتدار کی چاپلوسی میں لگے ہوں گے اور یہی دیوانے آج کی طرح کل بھی ہوشیار رہیں گے؛ اس لیے یہ مدارس جہاں بھی ہوں، جیسے بھی ہوں، ان کا سنبھالنا، اور چلانا مسلمانوں کا سب سے بڑا فریضہ ہے، اگر ان عربی مدرسوں کا کوئی دوسرا فائدہ نہیں تو یہی کیا کم ہے کہ یہ غریب طبقوں میں مفت تعلیم کا ذریعہ ہیں، اور ان سے فائدہ اُٹھا کر ہمارا غریب طبقہ کچھ اور اونچا ہوتا ہے اور اس کی اگلی نسل کچھ اور اونچی ہوتی ہے، اور یہی سلسلہ جاری رہتا ہے، غور کی نظر اس نکتہ کو پوری طرح کھول دے گی۔

مدارس کی اہمیت وضرورت اور مسلم معاشرے پر ان کے احسانِ عظیم کا تذکرہ کرتے ہوئے، علامہ سید سلیمان ندویؒ رقم طراز ہیں :

> اس وقت مدارسِ علوم دینیہ کا وجود مسلمانوں کے لیے ایسی بڑی نعمت ہے کہ اس سے بڑھ کر متصور نہیں، دنیا میں اگر اسلام کے بقاء کی کوئی صورت ہے تو یہ مدارس ہیں۔(۱)

---

(۱)　حقوق العلم:۵۱۔

حضرت مولانا مناظر احسن گیلانیؒ یوں فرماتے ہیں :

یہی کہفی مدارس تھے (علماء اور طلباء کے نسبت مولانا کی خصوصی اصطلاح) جنھوں نے مسلمانوں کے ایک طبقہ کو خواہ ان کی تعداد جتنی بھی کم ہے، اعتقادی واخلاقی گندگیوں سے پاک رکھنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔(۱)

مدارس دینیہ اور معاشی کفالت

مکی زندگی میں سب سے پہلے قائم ہونے والا مدرسہ ''مدرسہ دار ارقم'' تھا، جہاں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم حصولِ تعلیم کے لئے بلا روک ٹوک آتے جاتے تھیں اور اس میں ان کے لئے خورد ونوش، کھانے پینے اور قیام کا بھی انتظام تھا، طعام کا انتظام یہ تھا کہ نادار صحابہ کرام کے خورد ونوش کی کفالت مالدار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کرتے تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ تشریف لانے کے بعد مسجد نبوی کی بنا رکھی اور حجرہ شریف کی پشت پر شمالی جانب باب جبریل (علیہ السلام) اور باب النساء کے درمیان وسیع چبوترہ ''دکۃ الاغوات'' کے نام سے موسوم تھا، اس پر جو حضرات فروکش ہوتے تھے وہ ''اصحابِ صفہ'' کہلاتے تھے، یہاں پر طلبہ کا ہجوم رہتا، بعض اوقات سینکڑوں کی تعداد ہوجاتی، تمام اصحابِ صفہ کی مجموعی تعداد چار سو تک پہنچتی ہے، مختلف اوقات میں اس صفہ کے طالب علموں کی تعداد ستر، اسی تک پہنچ جاتی تھی، حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو یہ کام سپرد تھا کہ جو امداد اصحاب ثروت کی طرف سے ان طلبہ کے لئے آوے، اس کی حفاظت کریں اور بہ حصہ مساوی اس کو ان پر تقسیم کردیں، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے ذمہ طعام کا انتظام تھا، کھانے کے سلسلہ میں ایسا بھی ہوتا تھا کہ کھجوروں کے گچھے مالدار صحابہ بھیج دیا کرتے تھے اور بعض مالدار صحابہ ان طلبہ کو اپنے ساتھ لے جاتے اور انھیں کھانا کھلا دیتے، ان میں حضرت سعد بن عبادہؓ نہایت فیاضی سے کام لیتے تھے، حتیٰ کہ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ ۸۰/۸۰ طلباء کو اپنے ہمراہ گھر لے جاکر ان کو کھانا کھلاتے۔(۲)

آج کل علوم دینیہ اور مدارس دینیہ کی طرف سے مسلمانوں میں عام طور پر جو بے اعتنائی اور بے توجہی پائی جارہی ہے، یہ ایک لمحۂ فکریہ ہے ہی؛ مگر زیادہ تر افسوس اس بات کا ہے کہ اب بعض ایسے حضرات جو دین دار سمجھے جاتے ہیں اور جن کا تعلق بسا اوقات کسی اسلامی تحریک وتنظیم سے ہوتا ہے، وہ لوگ بھی دینی مدارس کو عموماً بے کار اور عضوِ معطل کی طرح سمجھنے لگے ہیں۔

---

(۱) الفرقان، افاداتِ گیلانی نمبر:۱۸۸، بحوالہ فتاویٰ رحیمیہ:۱/۴۹۔ (۲) سیر اعلام النبلاء:۱/۲۷۶۔

عہد نبوت اور زمانہ خلافت راشدہ سے لے کر زمانۂ مابعد میں اور پھر ہمارے ملک میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہندوستان پر قبضہ کر لینے تک دینی مدارس کی کفالت کا سامان بڑی بڑی جائیدادوں اوراوقاف کی آمدنیوں کی صورت میں ہوا کرتا تھا، پھر انگریزی حکومت کے دور میں مدارس دینیہ کے احیاء اور علوم دینیہ کے تحفظ وبقاء کے لئے چندہ کا موجودہ طریقہ اختیار کیا گیا، جس کو اس وقت عام طور پر سطحی نظر سے دیکھنے والے نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں؛ حالاں کہ ابتداء اسلام میں جس وقت تک سلاطین اور امراء کے ایسے اوقاف معرض وجود میں نہیں آئے تھے جن سے دینی ضروریات کو پورا کیا جا سکے، اس وقت تک علوم دینیہ اور تمام اُمور خیر کی انجام دہی مسلمانوں کے عمومی چندہ سے ہی ہوتی تھی، خود آنحضور سرور کائنات ﷺ نے بعض اُمور خیر کے لئے اصحاب خیر کو چندہ کی رغبت دلائی ہے اور آج بھی قومی اور ملکی ضروریات کے لئے چندہ کرنے کو نہ صرف یہ کہ عیب نہیں سمجھا جاتا؛ بلکہ اس کو بہت بڑی قومی اور ملکی خدمت سمجھا جاتا ہے۔

اس موضوع سے متعلق کتب کے مطالعہ سے یہ بھی معلوم ہوگا کہ قدیم زمانہ میں دینی مدارس کی ضرورت پوری کرنے کے لئے بڑی بڑی زمینیں وقف ہوتی تھیں اور امراء اسلام اس نیک مقصد کے لئے اپنی املاک کو وقف کرنا بڑی سعادت سمجھتے تھے، اسی لئے زمانہ قدیم میں دینی مدارس کے لئے تحصیل چندہ کا موجودہ طریقہ رائج نہیں تھا؛ مگر افسوس کہ علوم دینیہ کے لئے تحصیل چندہ جس سے ملت اسلامیہ کی حفاظت ہوتی ہے، آج شرفاء اسلام اور معززین قوم کی نگاہ میں خار ہے؛ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ طریقہ اختیار کرکے علماء کرام نے ملت اسلامیہ کو مٹنے سے بچالیا۔

اہل علم وفضل پر انعام اکرام کی ترغیب وفضیلت

مشہور محاورہ ہے کہ ''خدمت سے خدا ملتا ہے'' بلاشبہ خدا کو اپنے بندوں میں وہ بندے بہت پسند ہیں جو اپنے اوقات دوسروں کی خدمت میں صرف کرتے ہیں، یقیناً انسانیت کی خدمت بہت بڑی دولت ہے، جسے انسانوں کی خدمت کا موقع نصیب ہوتا ہے تو اس کی نسبت خدا کے پسندیدہ بندوں کی طرف ہوجاتی ہے، نبی رحمت ﷺ نے ان لوگوں کی تعریف فرمائی ہے جو انسانیت کی خدمت اور انھیں نفع پہنچانے کو اپنی سعادت سمجھتے ہیں، ارشاد نبوی ہے: ''خیر الناس من ینفع الناس'' (کنزالعمال) ''لوگوں میں سب سے بہتر وہ شخص ہے جو لوگوں کو فائدہ پہنچائے''، مگر مسلم معاشرہ میں ان سے ہٹ کر بعض لوگ وہ ہیں جو انسانوں اور جناتوں ہی کی نظر میں نہیں؛ بلکہ ملائکہ کی نگاہوں میں بھی قابل رشک ہوتے ہیں، فرشتوں کی مجلسوں میں ان کے چرچے ہوتے

ہیں، آسمانوں پر ان کے تذکرے ہوتے ہیں اور سمندروں میں ان کے لئے دُعائیں ہوتی ہیں، وہ کوئی اور نہیں؛ بلکہ علماء وحفاظ ہیں، اُمت مسلمہ کے یہ وہ مبارک اشخاص ہیں جن کی فضیلت و بزرگی اور بلندی و برتری قرآن کریم اور احادیث شریف میں بیان کی گئی ہے، ایسے لوگوں کی امداد و معاونت نہ صرف قابل تعریف ہے؛ بلکہ رب کریم اور آپ ﷺ کی نگاہ میں نہایت ہی مقام ومرتبہ کا حامل کارِ خیر ہے؛ چنانچہ قرآن وحدیث اس پر شاہد عدل ہیں، یہاں چند دلائل ذکر کئے جاتے ہیں :

لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ تَعْرِفُهُمْ بِسِيْمٰهُمْ لَا يَسْـَٔلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا وَ مَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ۔ (البقرۃ:۲۷۳)

اصل حق ان ضرورت مندوں کا ہے جو اللہ کے راستے میں گھرے ہوئے ہیں، وہ زمین میں چل پھر نہیں سکتے، دست سوال نہ پھیلانے کی وجہ سے ناواقف لوگ ان کو مالدار سمجھتے ہیں، تم ان کو ان کے چہرے سے پہچان سکتے ہو، وہ لوگوں سے نرمی کے ساتھ مانگا نہیں کرتے، تم جو بھی مال خرچ کروگے، اللہ تعالیٰ اس سے واقف ہیں۔(۱)

اس آیت کریمہ کے نزول کے سلسلے میں اکثر مفسرین کی رائے یہی ہے کہ یہ آیت اصحابِ صفہ (صفہ میں مقیم طالبانِ علوم نبوت) کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔(۲)

عن أبي رافع قال : لما ولدت فاطمة حسنا رضي الله عنهما قالت يا رسول الله ألا أعق عن ابني بدم قال لا ولكن احلقي شعره وتصدقي بوزنه من الورق على الأوفاض أو على المساكين قال قال علي قال شريك يعني بالأوفاض أهل الصفة ففعلت ذلك فلما ولدت حسينا فعلت مثل ذلك ۔ (۳)

(۱) ترجمہ از: آسان تفسیر قرآن مجید: مولانا خالد سیف اللہ رحمانی۔ (۲) تفسیر القرطبی، سورۂ بقرہ: ۲۷۳۔
(۳) السنن الکبریٰ للبیہقی، کتاب الضحایا، باب ما جاء فی التصدق بزنۃ شعرہ، حدیث نمبر:19082۔

حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے یہاں جب حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی ولادت ہوئی تو اس موقع سے انھوں نے آپ ﷺ سے فرمایا کہ کیا میں اپنے بیٹے کا عقیقہ کرلوں؟ تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ نہیں؛ بلکہ تم یہ کام کرو کہ اس کے سر کے بال کاٹ لو اور اس کے وزن کے برابر چاندی غرباء اور اوفاض (وہ صحابہ کرام مراد ہیں جو تعلیم کے لئے بے سروسامانی کی حالت میں مسجد نبوی میں پناہ گزیں تھے، یعنی اصحابِ صفہ) پر صدقہ کرلو؛ چنانچہ حضرت فاطمہؓ نے اس موقع سے اور حضرت حسین کی ولادت کے موقع پر بھی یہی کام کیا۔

عقیقہ کی خوشی کے موقع پر ہر انسان کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ اپنے اعزا و اقارب اور دوست واحباب کو اس مسرت کے حوالے سے مدعو کرے اور رسم دنیا بھی یہی ہے؛ لیکن اس کے باوجود آپ ﷺ کا یہ مال اصحابِ صفہ پر صدقہ کرنے کی ترغیب دینا یہ اس بات کا غماز ہے کہ طالبانِ علومِ نبوت پر خرچ کرنا عام مسلمانوں پر صدقہ کرنے سے بدرجہا بہتر ہیں:

عن علي، قال: قال النبي صلى الله عليه وسلم: لا أعطيكم وأدع أهل الصفة تلوى بطونهم من الجوع وقال مرة: لا أخدُمُكما وأدع أهل الصفة تطوى۔ (۱)

یہ ایک طویل حدیث ہے جس میں یہ واقعہ ذکر کیا گیا ہے کہ حضرت فاطمہؓ گھریلو کام کاج کی وجہ سے نڈھال ہو جایا کرتی تھی اور یہ ساری تکالیف حضرت علیؓ سے دیکھی نہیں جاتی تھی؛ چنانچہ اسی دوران آپ ﷺ کے پاس کہیں سے صدقہ کے غلام آئے تو حضرت فاطمہؓ حضرت علیؓ کے کہنے کی بنا پر آپ ﷺ کے پاس ایک غلام کا سوال کرنے کی غرض سے تشریف لے گئی جس کے جواب میں آپ ﷺ نے یہ تاریخ ساز جملے ارشاد فرمائے تھے اور صبح قیامت تک آنے والے ہر انسان کو اس بات کا پیغام دے دیا کہ دین واسلام کے سلسلے میں قرابت وتعلقات آڑے نہیں آنے چاہیے اور ہر اس جگہ اپنا مال خرچ کرنا چاہیے جہاں سے اسلام کی سربلندی وکامرانی کی صدا بلند ہوتی ہے؛ چنانچہ اس موقع پر بھی آپ ﷺ نے طالبان علوم نبوت کو اپنی اولاد پر ترجیح دی اور بعد میں آنے والے ہر انسان کو ایک پیغام دے دیا۔

---

(۱) مسند أحمد بن حنبل، مسند علي بن أبي طالب، حدیث نمبر:569۔

مکاتب و مدارس کی امداد و مالی معاونت ایک ایسا عمل ہے جو پائیدار بھی ہے اور لازوال بھی ، اس دنیائے رنگ وبو کی ہر چیز فنا کے گھاٹ اُتار دی جاتی ہیں؛حتیٰ کہ انسانی اعمال کا سلسلہ بھی اختتام زندگی کے وقت ختم کر دیا جاتا ہے؛لیکن چنداُمور ایسے ہیں کہ جن کا تعلق انسانی زندگی کے ساتھ محدود نہیں ؛ بلکہ انسانی زندگی فنا ہونے کے بعد بھی ان کا ثواب بدستور جاری وساری رہتا ہے اور صبح قیامت تک ان شاء اللہ بدستور جاری رہے گا، اس قسم کے چنداُمور ہیں جو مندرجہ ذیل حدیث میں مذکور ہیں :

> عن أنس قال : قال رسول الله صلى الله عليه و سلم : سبعة يجري للعبد أجرهن و هو في قبره بعد موته من علم علماً أو كرى نهرا أو حفر بئرا أو غرس نخلا أو بنى مسجدا أو ورث مصحفاً أو ترك ولدا يستغفر له بعد موته ۔ (۱)
>
> حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشادفرمایا کہ انسانی زندگی کے ختم ہونے کے ساتھ اس کے تمام اعمال کا ثواب بھی ختم کر دیا جاتا ہے؛لیکن سات لوگ ایسے ہیں کہ موت کے بعد بھی ان کے لئے ثواب بدستور جاری رہتا ہے،ان میں سے ایک وہ ہے جس نے کسی کو دینی تعلیم سے آراستہ کیا ہو، دوسرا وہ شخص جس نے انسانیت کی نفع رسانی کی غرض سے نہر بنوائی ہو، تیسرا وہ شخص جس نے انسانیت کی خاطر درخت لگوایا ہو، چوتھا وہ شخص جس نے مسجد کی تعمیر میں حصہ لیا ہو، پانچواں وہ شخص جس نے وارثین میں سے کسی کو قرآن کریم کا وارث بنایا ہو اور ساتواں وہ انسان ہے جس نے اپنے بعد اپنے لئے استغفار کرنے والی اولاد چھوڑی ہو۔

ایک اور موقع پر جب سعد بن عبادہؓ نے اپنی والدہ کے انتقال کے وقت آپ ﷺ سے دریافت کیا کہ میری والدہ فوت ہو چکی ہے تو ان کے لئے ایصال ثواب کی بہتر صورت کون سی ہو سکتی ہے تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ لوگوں کی تشنہ لبی کو سیراب کرنا (اس سے مراد ہر وہ عمل ہے کہ انسان کے فوت ہونے کے بعد بھی لوگ اس سے نفع حاصل کر سکیں)؛ لہٰذا مدارس ومکاتب پر خرچ کرنا تو اس سے بھی بہتر ہے ؛ کیوں کہ تعلیم کا سلسلہ

(۱) شعب الایمان للبیہقی،فصل فی الاختیار فی صدقۃ التطوع،حدیث نمبر:3449۔

ایک نہ ختم ہونے والا عمل ہے؛ یہی ایک وہ عمل ہے جسے زوال کا کوئی خطرہ نہیں اور نہ اس عمل کے بوسیدہ ہونے کا ڈر ہے۔

ان تمام آیات واحادیث سے یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہوتی ہے کہ مکاتب ومدارس کی اعانت ومعاونت اور تعلیم کے پیچھے اپنی آمدنی صرف کرنا، انسان کی اولین ترجیحات میں سے ہونا چاہئے ؛ کیوں کہ یہ ایک ایسا لازوال عمل ہے کہ جس کی ضیا پاش کرنیں ایک دنیا کو منور کرتی ہیں اور اس کی روشنی سے انسان صرف اس دنیا تک فائدہ نہیں اُٹھاتا؛ بلکہ قبر کی گھٹاٹوپ اندھیری رات میں بھی یہ اعمال اپنی کرنوں سے اور اپنے نور سے قبر کو منور کردیتے ہیں۔

دینی مدارس اور زکوٰۃ

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے مصارف زکوٰۃ کو بیان کرتے ہوئے آٹھ مصارف کا ذکر کیا ہے، جن میں سے پانچ کا مقصد غرباء ومساکین کی حاجت روائی ہے اور دو ''مؤلفۃ القلوب اور مجاہدین فی سبیل اللہ'' کا مقصد اعلاء کلمۃ اللہ ہے، زکوٰۃ کی مد سے عاملین زکوٰۃ کی مد انتظامی اُمور کی بحسن وخوبی انجام دہی کے لئے ہے؛ اب مصرف زکوٰۃ کی روح اور دینی مدارس کے نظام اور اس کے کردار پر غور کیجئے ، دینی مدارس کی حیثیت عام درسگاہوں کی نہیں ہیں، عام درسگاہوں اور اداروں کا مقصد بچوں کو ایسی تعلیم سے آراستہ کرنا ہے جو آئندہ ان کو ملازمت دلائے اور بہتر سے بہتر معیشت وتجارت کے اسباب ووسائل فراہم کرسکے، دوسری جانب سرکاری تعلیم گاہوں اور اداروں کی زبوحالی نے ایسی تعلیم کو ایک نفع بخش اور سودمند تجارت کی حیثیت دے دی ہے؛ لیکن دینی مدارس کی حیثیت تجارت کو فروغ دینے اور معیشت کو بہتر بنانے کی نہیں ہے؛ بلکہ وسعت وتنگی ہر دو حالت میں سرحد اسلام کی حفاظت اور اس کے لئے اپنے آپ کو قربان کردینے کی ہے، خاص کر ہندوستان میں ان کہفی مدارس کے وجود وقیام کا ایک خاص پس منظر ہے۔

جب ہندوستان سے مسلمانوں کے اقتدار کا سورج غروب ہونے لگا اور انگریز قوم نہایت چالبازی کے ساتھ اپنے قدم بڑھانے لگی تو اس نے ہندی قوم کو مستقل اپنے زیر اثر رکھنے کے لئے ان کی فکر ونظر میں تغیر کو لازم سمجھا؛ چوں کہ اس قوم کو زیادہ خطرہ مسلمانوں سے تھا، اس لئے انھوں نے ہندو اور مسلم دونوں کو؛ خاص کر مسلمانوں کو اپنی فکری یورشوں کا نشانہ بنایا اور اسلام کے خلاف شکوک وشبہات اور بےجا اعتراضات کا دروازہ کھول دیا؛ تاکہ ہندی مسلمانوں کی نئی نسل اسلام اور تعلیمات اسلام کے تعلق سے غیر مطمئن ہوجائے اور اسلام

سے ان کا رشتہ برائے نام رہ جائے ، ساتھ ساتھ عیسائی مشینریز اور عیسائی پادریوں کوتبلیغ عیسائیت کے لئے میدان فراہم کئے ؛ تاریخ کے صفحات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کام کے لئے ایک ہی شہر اور گاؤں میں کئی کئی پادریوں کے قافلے اُترتے تھے اور عیسائیت کی تبلیغ واشاعت کے لئے مستقل طور پر بڑے بڑے پادریوں کو برطانیہ سے بلایا جاتا تھا۔

دوسرے انگریزوں نے بلا تاخیر ہندوستان میں ایک نیا نظام تعلیم شروع کر دیا، جس کا مقصد ہندوستانیوں کو اپنی تہذیب وثقافت سے دُور کر کے مغربی تہذیب سے قریب سے قریب تر کرنا تھا، بقول لارڈ میکالے اس نظام تعلیم کا مقصد یہ تھا کہ یہ قوم رنگ ونسل کے تعلق سے تو ہندوستانی ہو؛ مگر دل ودماغ کے حوالے سے انگریزی ہو، ہندوؤں کے لئے یہ صورت حال چنداں قابل تشویش نہیں تھی؛ کیوں کہ ان کے مذہب کی بنیاد کسی متعین فکر وعقیدہ پر نہیں، اسی لئے اس قوم کے بیشتر افراد اپنے مذہب اور اپنے نظریات سے بے خبر ہوتے ہیں، انگریزوں کی اصل دشمنی تو مسلمانوں سے تھی، وہ چاہتے تھے کہ کسی طرح مسلمانوں کے اسلام کا سودا کریں، ان حالات میں بالغ نظر اور دردمند علماء نے محسوس کیا کہ سیاسی اقتدار تو اب رخصت ہونے کو ہے؛ لہٰذا اب مسلمانوں کے ایمان اور ان کی فکر ونظر کی حفاظت کرنی چاہئے اور ایک ایسی نسل تیار کرنی چاہئے جو مادیت پرستی اور دنیا پرستی کے رجحان سے آزاد ہو، جو ہمہ وقت دنیا کے مقابل دین کو ترجیح دیں اور جو دین اسلام کی حفاظت اور اس کی سربلندی کے لئے اپنے آپ کو وقف رکھیں۔

چنانچہ اس منصوبے کے تحت پورے ملک میں مکاتب ومدارس کا جال بچھا دیا گیا اور ایک ایسے نظام تعلیم کو وجود بخشا گیا جو حکومت کی مداخلت سے آزاد ہو؛ حتی کہ حکومت مدد کرنا بھی چاہے تو اس کی مدد قبول نہ کی جائے اور ہر طرح سے سرکاری مداخلت سے آزاد ہو کر یہاں سے دین کی حفاظت اور تعلیمات اسلام کے تحفظ کے جذبے سے سرشار اور ایثار وقربانی سے سرمست بادہ خواروں کی ایک ایسی تعداد پیدا کی جائے جو دین کی حفاظت کے لئے دنیا کو قربان کر دیں؛ چنانچہ وہ اس مشن میں کامیاب رہیں اور ان مکاتب ومدارس نے ایک ایسے گروہ اور طبقے کو وجود بخشا جس نے فقر وغربت اور مادی سہولتوں سے محرومی کے تیر بھی سہے اور طنز وتعریض کے نشتر بھی برداشت کئے؛ لیکن نہ کوئی ڈر اور خوف انھیں اپنے مشن سے دور کر سکا اور نہ دنیا کی چمک دمک ان کی راہ میں حائل ہوسکی۔

گذشتہ دوسو سال سے اسلام کے خلاف جتنی یورشیں ہوئی ہیں، ان کا مقابلہ کس نے کیا ہے؟ جب ہندوستان میں عیسائی مبلغین سرگرم عمل تھے اور بھولے بھالے مسلمانوں کو نشانہ بنا رہے تھے، اس وقت

مسلمانوں کے اسلام کی حفاظت کس نے کی؟ جب آریہ سماجی تحریک افلاس زدہ اور جاہل مسلمانوں کو لقمہ ارتداد بنارہی تھی، اس وقت کون سا گروہ میدان عمل میں آیا؟ جب مستشرقین اور ملحدین کی جانب سے اسلام اور فرامین نبوی ﷺ کے خلاف شکوک وشبہات کا دروازہ کھول دیا تا کہ نسل نو اسلام کا طوق اپنے گلے سے اُتار پھینکے، اس وقت کس گروہ نے سینہ سپر ہوکر ان دریدہ دہن مستشرقین کے اعتراضات کا جواب دیا؟ جب نوجوان نسل کو کمیونزم کا نشہ پلایا گیا اور انھیں دین و مذہب سے آزاد ہوکر روشن خیال بننے کی دعوت دی گئی تو وہ کون لوگ تھے، جنھوں نے پوری معقولیت کے ساتھ اس کا مقابلہ کیا؟ اور جب مسلمانوں کے شرعی قوانین پر دست درازی کی جانے لگی تو وہ کون لوگ تھے، جنھوں نے بغیر کسی خوف وڈر کے اس کا مقابلہ کیا اور ان کالی گھٹاؤں کا رُخ موڑا؟ یہ سب ان ہی بے نوا فقیروں اور ناسمجھ مسلمانوں کی بے جا تنقید کا نشانہ بننے والے مولویوں کا کارنامہ تھا کہ جو مادی نقصانات کے باوجود اور ہر طرح سے بے خوف ہوکر استقامت کی راہ پر ڈٹے رہیں، ادھر ڈیڑھ سو سال سے ہندوستان میں جتنی مذہبی جماعتیں اُٹھی ہیں، ان کی رگوں میں کن کا خون دوڑ رہا ہے اور ان کا اصل سرچشمہ اور منبع کون ہے؟ یہی وہ مدارس ہیں جنھوں نے جماعتوں کو اچھے داعی اور مبلغ فراہم کئے، علمی دنیا کو اسلامیات کا لٹریچر فراہم کیا اور گاؤں گاؤں اور قریہ قریہ ائمہ وخطباء کی ایک تعداد فراہم کی کہ جن کا عام مسلمانوں کے اسلام کی حفاظت میں بڑا کردار رہا ہے؛ غرض یہ مدارس پاور ہاؤس ہیں، جن سے دین کے تمام شعبوں کو غذا ملتی ہے اور اسلام کے ہر کاز کو قوت بہم پہنچتی ہے؛ اسی لئے فرقہ پرست طاقتیں آج مدارس کو نشانہ ہدف بنائے ہوئی ہیں، کیوں کہ انھوں نے محسوس کرلیا ہے کہ جب تک یہ مدارس اور اس مدارس سے پیدا ہونے والے ''ملا'' باقی رہیں گے تب تک مسلمانوں کو اسلام سے اور اسلامی تہذیب وثقافت سے دُور کرنا ناممکن ہے اور یہ حقیقت بھی ہے کہ انہیں دینی مدارس کی وجہ سے ہندوستان میں سپین کی تاریخ نہیں دہرائی جاسکی ہے، اس لئے بلاخوف وتردد اور بغیر کسی طرفداری کے یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ اس وقت اسلام کی حفاظت وبقا اور اس کی اشاعت وتبلیغ کا ذریعہ یہی مدارس ہیں، نیز یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ان مدارس سے فیض یاب ہونے والوں میں ایک بڑی تعداد ایسے بچوں کی ہوتی ہیں جن کا تعلق غریب گھرانوں سے ہوتا ہے اور معاشی طور پر کمزور ہوتا ہے، ان حقائق اور اسباب کو جاننے کے بعد یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ ان مدارس کو زکوٰۃ ادا کرنے میں زکوٰۃ کے دونوں مقاصد بیک وقت حاصل ہوتے ہیں، غرباء کی مدد بھی ہوتی ہے اور اسلام کی حفاظت اور اس کی سربلندی کا مقصد بھی حاصل ہوتا ہے۔(۱)

---

(۱) مستفاد از جدید فقہی مسائل، دینی مدارس اور زکوٰۃ: ۳/۳۴۶۔

اسی لئے فقہاء ومحدثین نے اس مد میں خرچ کرنے کی ترغیب دی ہے اور اس کو زیادہ باعث اجر وثواب قرار دیا ہے؛ چنانچہ مشہور حنفی عالم، ابن نجیم مصریؒ ''البحر الرائق'' میں فرماتے ہیں :

التصدق على العالم الفقير أفضل ۔ (۱)

محتاج عالم دین پر خرچ کرنا اور اسے زکوٰۃ کا مال دینا عام لوگوں پر صدقہ کرنے سے اور ان کو زکوۃ کا مال دینے سے بہتر ہے۔

اسی طرح مشہور حنفی عالم محمد بن اسماعیل الطحطاوی اپنی کتاب '' حاشیۃ الطحطاوی علی مراقی الفلاح'' میں فرماتے ہیں :

أن طالب العلم يجوز له أخذ الزكاة ولو غنياً إذا فرغ نفسه لإفادة العلم واستفادته لعجزه عن الكسب ۔ (۲)

جس شخص نے اپنے آپ کو حصول علم کے لئے فارغ کر دیا ہو، ایسے شخص کے لئے زکوۃ کا مال لینے کی گنجائش ہے؛ اگر چہ وہ طالب علوم نبوت مالدار ہی کیوں نہ ہو، اور یہ اس وجہ سے ہے کہ شرعی علوم کی تحصیل میں مصروف ہونے کی بنا پر ان کے لئے کسبِ معاش ایک دشوار تر امر ہے۔

اسی طرح علامہ ابن عابدین شامیؒ نے ''ردالمحتار'' میں یہ بات نقل فرمائی ہے :

أن من مصارف بيت المال كفاية العلماء ، وطلاب العلم المتفرغين للعلم الشرعي ۔ (۳)

بیت المال کے مصارف میں سے ایک مصرف علماء کی مالی اعانت کرنا ہے اور ان لوگوں کی جنھوں نے اپنے آپ کو علوم شرعیہ کے حصول کے لئے فارغ کر رکھا ہے۔

مشہور مالکی عالم علی بن احمد العدوی ''حاشیۃ العدوی'' میں فرماتے ہیں :

---

(۱) البحر الرائق شرح کنز الدقائق، کتاب الزکوۃ، باب المصرف: 2/269۔

(۲) حاشیۃ الطحطاوی علی مراقی الفلاح شرح نور الایضاح، کتاب الزکوۃ، باب المصرف: 473۔

(۳) ردالمحتار، کتاب الجہاد، مطلب فی مصارف بیت المال: 16/238۔

وينبغي أن يقصد بصدقته طالب علم ومنقطعا لعبادة ، وقد كانت عائشة تقصد بصدقتها أهل العلم وكذا ابن المبارك ۔ (۱)

اور طلبہ علومِ دینیہ اور عبادت کے لئے خود کو فارغ کرنے والے افراد پر صدقہ وخیرات خرچ کرنا زیادہ مناسب (افضل) ہے،حضرت عائشہؓ اپنے صدقہ کا مال اہلِ علم پر ہی خرچ کیا کرتی تھی اور اسی طرح عبداللہ بن مبارکؒ بھی اپنا مال اہل علم پر خرچ کرتے تھے۔

علامہ ابن عابدین شامیؒ نے "تنقیح الفتاویٰ الحامدیہ" میں یہ عبارت ذکر کی ہے :

وقد ذكر ابن عابدين في تنقيح الفتاوى الحامدية : أنه تلزم على المسلمين كفاية طالب العلم إذا خرج للطلب ؛ حتى لو امتنعوا عن كفايته يجبرون كما يجبرون في دين الزكاة إذا امتنعوا عن أدائها ۔ (۲)

طالب علم جب حصول علم کی غرض سے نکلے تو اس وقت عوام الناس کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس کی کفالت کریں اور اس کے اخراجات برداشت کریں ؛ یہاں تک کہ اگر عوام امداد ومعاونت سے انکار کریں تو اس صورت میں عوام کو ایسے طلباء کی کفالت پر مجبور کیا جائے گا جیسا کہ زکوٰۃ ادا نہ کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔

قرآن وسنت اور فقہاء کی ان تمام عبارات سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ علوم شرعیہ کے حصول میں مصروف علماء وطلبہ کی مالی امداد ومعاونت عوام کا نہ صرف اخلاقی فریضہ ہے ؛ بلکہ شرعی نقطۂ نظر سے بھی ان لوگوں کی ذمہ داری ہے ؛ چنانچہ عہد نبوی میں اور اس کے بعد کے ادوار میں بھی علماء وطلباء کی امداد لوگوں کا وطیرہ رہا ہے ؛ اسی لئے حضرت عائشہؓ اپنا مال اہل علم وفضل پر صدقہ کیا کرتی تھی اور ہمارے اسلاف واکابر میں بھی کئی لوگ ایسے گزرے ہیں کہ جن کا شیوہ ہی اہل علم کی مدد کرنا تھا،عبداللہ ابن مبارکؒ کے سلسلے میں مشہور ہے کہ وہ اپنا مال

(۱) حاشیۃ العدوی علی شرح کفایۃ الطالب الربان، باب الہبۃ والصدقۃ: 6/378۔

(۲) تنقیح الفتاویٰ الحامدیۃ، باب النفقۃ: 1/484۔

اہل علم پر خرچ کیا کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ مقام نبوت کے بعد علماء سے بڑھ کر کوئی بلند مقام نہیں؛ اسی طرح امام لیث بن سعد کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ ہر سال امام مالک کی خدمت میں سو دینار بھیجا کرتے تھے، ایک مرتبہ امام مالکؒ نے اپنے ذمہ قرض کے بارے میں ایک خط لکھا تو امام لیث بن سعد نے پانچ سو دینار امام مالکؒ کی خدمت میں بھیجے۔

موجودہ حالات میں مدارس کے تئیں ہماری ذمہ داری

دینی مدارس اسلام کی حفاظت گاہیں ہیں، ان مدارس کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ ان کے بانیوں نے سرکاری مداخلت سے آزاد ہو کر ایک ایسا نظام تعلیم دریافت کیا، جو غریب سے غریب تر مسلمان کے گھر میں علم کی شمع جلا سکے اور ہر کچے پکے گھر میں دینی تعلیم کی شعاعیں پہنچا سکے، ہمارے بزرگوں نے مدارس کے نظام کو نہایت ہی معمولی اور سادہ رکھا، معمولی عمارتیں، کم تنخواہ پانے والے اساتذہ و خدام اور تصنع و تکلف سے عاری طلبہ، جن کا سراپا ان کی سادگی و درویشی پر گواہ ہوتا ہے، یہ ادارے مستقل اور قابل بھروسہ مالی وسائل سے محروم ہیں، اور عام مسلمانوں سے دو چار پیسوں کی امداد ہی ان کی کل کائنات ہوتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ انھیں مدارس اور درویش مزاج علماء نے اس ملک میں اسلام کی حفاظت کی ہے، انھوں نے عہد بہار میں تو کوئی صلہ نہیں پایا؛ لیکن عہد خزاں میں اپنے خون جگر سے سینچ کر اسلام کے شجر طوبی کو بچایا ہے، اسلامی تہذیب وثقافت کا تحفظ کیا، اور مسلمانوں کا اپنے دین اور مذہب سے نہ صرف رشتہ باقی رکھا؛ بلکہ اس رشتہ کو مضبوط سے مضبوط تر کرنے میں کامیابی و کامرانی سے ہمکنار ہوئیں، اُمت کے ہر طبقہ کو اعتراف ہے کہ جاں گسل حالات کے باوجود آج اس ملک میں اس شان وبان کے ساتھ اسلام کا باقی رہنا دینی مدارس کا دین ہے، اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر واحسان ہے کہ مسلمانوں نے اس حقیقت کو سمجھ لیا اور انھوں نے ملک کے گوشہ گوشہ میں ایسے مدارس کی بنیاد ڈالی جو ہمارے لیے لال قلعہ سے زیادہ مضبوط، چار مینار اور قطب مینار سے زیادہ بلند اور تاج محل سے زیادہ خوبصورت میراث ہے! (۱)

وبائی بیماری اور لاک ڈاؤن کی وجہ سے سب سے زیادہ متاثر ہونے والے اداروں میں دینی مدارس بھی سرفہرست ہیں؛ کیوں کہ لاک ڈاؤن اور معاشی سرگرمیوں کے یکسر نہ سہی؛ مگر ایک حد تک اس میں گراوٹ آجانے کی وجہ سے تجارت پیشہ افراد اور عام مسلمانوں کی روز مرہ کی زندگی کافی حد تک متاثر ہو چکی ہے اور اس کا

---

(۱) مستفاد از: دینی و عصری تعلیم - مسائل اور حل: ۵۵۔

اثر دینی مدارس پر بھی ہوا ہے،موجودہ دور کے مدارس کی آمدنی کا کوئی مستقل ذریعہ نہیں ہوتا ہے؛ بلکہ یہ مدارس انھیں حضرات کی نظر التفات سے اپنے اپنے کاز میں سرگرم عمل ہیں ،ایسے حالات میں دین اسلام اور تعلیمات نبوی سے محبت کرنے والے ہر فرد کے لئے لازم وضروری ہے کہ مدارس کے ان حالات سے باخبر ہو اور ممکن حد تک ان اسلامی قلعوں کے حفاظت کی تدبیر کرے؛ نیز بقدر استطاعت اپنی ضروریات میں سے بچا کر ان مدارس کی مدد کرے اور ان مدارس کو روبہ زوال ہونے سے بچانے کی فکر کرے؛غرض کہ یہ مدارس اسلامیہ ہماری شہ رگ ہیں،ان سے ہمارا دینی وجود وابستہ ہے،عجب نہیں کہ اگر یہ ختم ہو جائیں تو ہماری آنے والی نسلیں اسلام سے دور اور تعلیمات اسلام سے بدظن ہو جائے،اس لئے ہر اسلام پسند فرد کا فریضہ ہے کہ وہ اپنے ان ملی اثاثوں کی فکر کریں اور انھیں اپنے ہی وجود کا ایک حصہ سمجھیں،جس طرح ہر انسان معاشی ابتری کے باوجود اپنے اپنے گھر کی کفالت کو اپنی ذمہ داری سمجھتا ہے،ٹھیک اسی طرح ان مدارس کی کفالت کو بھی اپنے اوپر لازم سمجھیں۔

ارباب مدارس کی خدمت میں چند گزارشات اور تجاویز

ایک زمانہ تھا کہ مدارس سے فارغ ہونے والے طلبہ کی تعداد بہت کم ہوتی تھی اور جتنے طلبہ فارغ ہوتے تھے،سارے کے سارے طلبہ مدارس ومساجد میں ہی کھپ جاتے تھے؛ بلکہ اس زمانے میں ان علماء کی اہمیت اور ڈیمانڈ زیادہ ہوتی تھی؛ کیوں کہ اس وقت فارغ ہونے والے طلبہ کی تعداد کم اور مساجد ومدارس میں ان کی ضرورت زیادہ ہوتی تھی؛لیکن مادیت کا بڑھتا ہوا رجحان،اخلاص وروحانیت میں کمی اور گرد وپیش کی دنیا سے متاثر ہونے کے نتیجے میں آج یہ سوال ہمارے سامنے کھڑا ہو چکا ہے کہ علماء وطلباء کی معاشی حالت کیسے بہتر بنائے؟ اسلامی تاریخ میں مدارس بنیادی طور پر اوقاف کے نظام کے تحت کام کرتے رہے ہیں اور مدارس ومساجد کے لئے ایک باوقار طریقہ تھا؛لیکن استعماری دور میں اوقاف کے اس نظام کو برباد کر دینے بعد بالغ نظر علماء نے بامر مجبوری چندے کا طریقہ اختیار کیا تا کہ ضروری دینی تعلیم کے سلسلے کو جاری رکھا جا سکے؛ مگر اب صورت حال یکسر تبدیل ہو چکی ہے،عوام جو ان مدارس کو اسلامی قلعے تصور کرتی تھی،آج مدارس اور علماء کی معاشی تنگیوں کی وجہ سے ایک بڑی تعداد اپنا نظریہ تبدیل کر چکی ہے اور ان مدارس اور علماء کو حقارت کی نظر سے دیکھنے لگی ہے؛چنانچہ مولانا اشرف علی تھانویؒ فرماتے تھے کہ :

> مدارس کے متعلق میری ایک رائے یہ ہے کہ دینی مدارس میں صنعت وحرفت کا بھی انتظام ہو،خواہ طلبہ بعد میں یہ کام نہ کریں؛لیکن سکھا یا ضرور جائے،اس لیے کہ

> آج کل عام لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ان مولویوں کو اس کے سوا اور کچھ نہیں آتا، اس لیے وہ انھیں اپنا محتاج سمجھتے ہیں جس سے ان کی تحقیر ہوتی ہے، اگر کوئی دستکاری وغیرہ سیکھ لیں اور کسی وقت کسبِ معاش کی ضرورت ہو تو اپنے کام میں تو لگ جائیں گے اور اس طرح چندہ مانگنے سے بچ جائیں گے، اس لیے کہ چندہ مانگنے میں حد درجہ تحقیر ہے۔(۱)

ان حالات اور مسائل کے پیش نظر ارباب مدارس اور منتظمین مدارس کی خدمت میں چند تجاویز اور گزارشات پیش ہیں جو ایک عجالہ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی ہیں؛ لیکن کیا عجب کہ اس سے فکر وعمل کی راہوں میں کوئی کام کی چیز ہاتھ آجائے :

(۱) دینی تعلیم میں مہارت اور اختصاص کے لیے صلاحیت اور استعداد نیز رجان طبع کا ایک معیار مقرر کیا جائے اور انھیں طلبہ کو اس میں آگے بڑھنے کا موقع دیا جائے جو ایک ''عالم دین'' کے طور پر معاشرے میں بہتر سے بہتر کردار ادا کر سکیں، ان کے علاوہ مدارس سے رُجوع کرنے والے عام طلبہ کے لیے مختلف سطحوں پر ان کی ضرورت اور صلاحیت کے لحاظ سے مختلف دورانیے کے متبادل نصابات تشکیل دیے جائیں، جنھیں مکمل کرنے کے بعد دو سال، تین سال یا چار سال میں وہ سسٹم سے باہر جا سکیں اور دیگر میدانوں سے منسلک ہو کر خود مکتفی بن سکے، ایسے حضرات کو دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ چند ایسے ہنر لازماً سکھائے جائیں جو مستقبل میں ان کے روزگار کے سلسلے میں ان کی مدد کریں۔

(۲) کچھ مہارتیں ایسی ہیں جو ہمارے مدارس کے فضلاء بہت آسانی سے حاصل کر سکتے ہیں اور ان سے جلد مناسبت ہو جاتی ہے، اور بعض ایسی ہیں جو ان کے شعبے سے بہت زیادہ گہری وابستگی رکھتی ہیں، ان میں مثال کے طور پر ایک شعبہ پبلشنگ کا ہے کہ آپ کتابیں چھاپیں، اگرچہ دینی کتابوں کی پبلشنگ کے مسائل ہیں، مشکلات ہیں، اتنا زیادہ نفع آور نہیں رہا جتنا پہلے ہوتا تھا، مجموعی طور پر اپنی اور ان کی ناعاقبت اندیشیاں ہیں جن کی وجہ سے یہ صورتحال بن چکی ہے؛ لیکن بہرحال یہ بھی ایک شعبہ ہے جو ان کی فیلڈ سے مناسبت رکھتا ہے، اگر اچھی اور معیاری لٹریچر اور کتابیں چھاپیں اور بیچیں تو ایک یہ راستہ ان کے لیے معاون بن سکتا ہے۔

(۳) ایک یہ شعبہ جس میں ہمارے فضلاء بہت آسانی سے جا سکتے ہیں، وہ صحافت اور میڈیا کا شعبہ ہے،

---

(۱) الافاضات الیومیہ: ۲۶۶/۶۔

چاہے وہ پرنٹ میڈیا ہو یا الیکٹرانک میڈیا ہو؛ کیوں کہ ابلاغ کی عادت اور رجحان درس وتدریس کے دوران ان کا بن چکا ہوتا ہے، کچھ الفاظ جوڑنے کا کام آہی جاتا ہے، اس میں تھوڑی سی تربیت کی ضرورت ہوتی ہے جس کے بعد وہ یہ کام آسانی سے سیکھ جاتا ہے۔

(۴) ایک شعبہ کمپیوٹر کا ہے، تجربہ یہ ہوا ہے کہ ہمارے فضلاء اس کام کو بآسانی سیکھ جاتے ہیں اور بعض اچھی جگہوں پر بھی پہنچ جاتے ہیں، ہمارے یہاں ''المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد'' کے کچھ فضلاء اچھی کمپنیوں میں اور کئی ایک فضلاء اسکولوں اور پرائیویٹ اداروں میں کمپیوٹر کے شعبے سے وابستہ ہیں؛ نیز یہ ایک صاف ستھرا شعبہ ہے اور علم سے مناسبت بھی رکھتا ہے۔

(۵) ایک اہم شعبہ زبان کا شعبہ ہے، گلوبلائزیشن کے اس دور میں دنیا سمٹ رہی ہے اور روابط بڑھ رہے ہیں، اس صورت حال میں زبان سیکھنا اور سکھانا ایک مستقل فن بن چکا ہے، یونیورسٹیز مختلف زبانوں کو لے کر ششماہی اور یک سالہ ''ڈپلوما ان لینگویج'' کے کورسز کراتی ہیں، ہمارے فضلاء عربی زبان آسانی سے سیکھ سکتے ہیں، فارسی زبان بھی آسانی سے سیکھ سکتے ہیں؛ نیز زمانہ طالب علمی سے ہی پڑھنے لکھنے کی وجہ سے دیگر زبانیں بھی بآسانی سیکھ سکتے ہیں، زبان اور ترجمہ کا یہ فن ان کے لئے بہت سے مواقع فراہم کرسکتا ہے۔

(۶) ایک شعبہ پرائیویٹ سکولوں کا ہے، تعلیمی میدان میں سرکاری اداروں کی زبوں حالی نے پرائیویٹ اسکولوں کے قیام کے رجحان کو خوب فروغ دیا ہے اور عالمی سطح پر نوبت یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ یہ تعلیمی ادارے مستقل تجارت کی حیثیت اختیار کرچکے ہیں، صرف عام تجارت پیشہ افراد ہی نہیں؛ بلکہ اعلیٰ سرکاری ملازمین اور بذات خود حکومت اس راہ سے بہت کمارہی ہے، پرائیویٹ سکولوں کے اس شعبے میں ہمارے فضلاء مدارس کے لئے کافی گنجائش موجود ہے اور یہ شعبہ ان کے فیلڈ سے مناسبت بھی رکھتا ہے، اگر مدارس میں ایسے فضلاء کے لئے ششماہی اور یک سالہ ایسے نصاب مرتب ہوجائیں، جن میں سکول مینجمنٹ اور ٹیچر ٹریننگ کے کچھ اُصول وضوابط سکھا کر انھیں اس میدان میں کام کرنے کی تربیت دے دی جائے تو یہی فضلاء اپنے اپنے گاؤں، قصبے اور چھوٹے شہروں میں جاکر سکول قائم کرسکتے ہیں اور صرف اپنے لئے ہی نہیں؛ بلکہ دوسرے لوگوں کو بھی روزگار کے مواقع فراہم کرسکتے ہیں۔

آج سے تقریباً بائیس سال قبل ان ہی مقاصد کو سامنے رکھتے ہوئے فقیہ العصر حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی دامت برکاتہم نے ''المعہد العالی الاسلامی'' قائم فرمایا، ''المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد'' ملک وبیرون

ملک دیگر مدارس اور دینی اداروں کے لئے مثالی اور قابل تقلید ادارہ ہے، یہ علم و دانش اور فکر وفن کی نرالی تربیت گاہ ہے، یہاں علوم اسلامی — اختصاص فی علوم القرآن، اختصاص فی علوم لحدیث، اختصاص فی الفقہ والقضاء، مقارنہ بین المذاہب اور انگریزی زبان وادب — کے ساتھ ساتھ فضلاء کو موجودہ دور کے مسائل، نت نئے افکار اور اُمت کو درپیش چیلنجز کا سامنا کرنے کی اور ان سے نمٹنے کی تربیت دی جاتی ہے، اس ادارے کی خصوصیت یہ ہے کہ یہاں دین و دنیا اور دینی وعصری علوم کا سنگم ہے، جہاں علوم اسلامی میں رُسوخ اور گہرائی وگیرائی فضلاء میں پیدا کی جاتی ہے، وہاں انھیں مختلف محاضرات اور لیکچرز کے ذریعے انگریزی زبان وادب، دورحاضر کے باطل افکار ونظریات، اسلام کی فکری ونظری تعلیمات کی افادیت اور مذہب اسلام کی صحیح ترجمانی کی تربیت دی جاتی ہے؛ نیز معاشرہ وسماج میں اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کی اور خود مکتفی بننے کی بھی تربیت دی جاتی ہے، یہاں کے فضلاء اس وقت ہندوستان اور بیرون ہند مختلف مدارس، دینی مراکز ومساجد، اسکولوں، مختلف کمپنیوں اور یونیورسٹیز سے وابستہ ہیں، ہندو بیرون ہند مدارس اور خاص کر ہندوستانی دینی اداروں کو اس ادارے سے روشنی حاصل کرنی چاہئے اور اپنے اپنے مدارس میں اس نہج پر مفید اور کارآمد ایک نئی طرح ڈالنی چاہئے، اس سے دینی مدارس کی اہمیت وافادیت بھی عوام کے سامنے واضح ہوگی اور دین سے دُوری کے اس دور میں عوام مدارس ومراکز سے قریب سے قریب تر ہوگی اور اسے اپنا قیمتی اثاثہ اور ملی سرمایہ تصور کرنے لگے گی۔

• • •

فتاویٰ ہندیہ کے بعض اہم قلمی مصادر
(۱)

مولانا محمد ندوی
(باحث شعبۂ تحقیق: المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد)

اسلام کی خصوصیت یہ ہے کہ ہر زمانہ میں اس کے پیروکاروں میں ایسی عبقری و باکمال شخصیات پیدا ہوئیں جنھوں نے مختلف جہتوں سے اس کی خدمت انجام دی، خواہ اسلام دشمن عناصر سے میدان کارزار میں مقابلہ کا مسئلہ ہو، یا اس پر ہونے والے اعتراضات کے جواب کا مسئلہ، دنیوی زندگی میں پیش آنے والی پیچیدگیوں کے حل کا معاملہ ہو یا معاشرتی وسماجی زندگی میں حلال وحرام کے حل کی بات، ہر اعتبار سے اسلام کو مستحکم کرنے اور اس کی نشر واشاعت کا فریضہ انجام دیا۔

قرن اول ہی سے ہندوستان کو بھی یہ شرف حاصل رہا کہ یہاں اصحابِ رسول ﷺ، تابعین، تبع تابعین، محدثین، فقہاء، نیک صفت سلاطین نے اپنے وجود سے اس کو رونق بخشی اور یہاں پاکیزہ وستودہ صفات، بلند اخلاق وکردار، اعلی تہذیب وثقافت اور تعلیم وشائستگی کی طرح ڈالی، اور اپنے علم وعمل، فکر وفن، پند ونصیحت، تصنیف وتالیف، صنعت وحرفت، جان ومال، شجاعت وبہادری کے ذریعہ اس ملک کی خدمت کی۔

علماءِ، فقہاء، محدثین وصوفیا کے علاوہ ہندوستان میں بعض حکمران وقت ایسے باکمال ہوئے ہیں، جنھوں نے اپنی نیک نفسی، دنیا سے بے رغبتی، علم دین میں رُسوخ اور علم پروری سے عہد ماضی کے سنہرے دنوں کی یاد تازہ کردی؛ چنانچہ ایسی ہی باکمال شخصیات میں سے ایک مظفر الدین اورنگ زیب عالمگیرؒ ہیں۔

آپ کی پیدائش ۱۵/ذوالقعدہ ۱۰۲۸ھ کو دوحد کے مقام پر ہوئی، آپ نے مختلف اہل علم سے کسب فیض کیا، جن میں مولانا عبد اللطیفؒ، مولانا ہاشم گیلانیؒ اور شیخ محی الدین بن عبد اللہ بہاریؒ وغیرہ بطور خاص قابل ذکر ہیں، آپ کو علم اور اہل علم سے قلبی لگاؤ تھا، آپ نے خدمت خلق وملک وملت کے ساتھ ساتھ دین اسلام اور نشر اسلام

کا لازوال فریضہ انجام دیا، یہی وجہ ہے کہ برصغیر میں اسلامی احکام کی نشر واشاعت میں آپ کا بڑا حصہ ہے، آپ یکم ذوالقعدہ ۱۰۶۸ھ (بمطابق: ۲۳؍جولائی ۱۶۵۸ء) کوتخت ہند پر متمکن ہوئے، پچاس برس حکومت کی اورنوے برس عمر پا کر ذوالقعدہ ۱۱۱۸ھ (۲۱؍فروری ۱۷۰۷ء) کودکن میں وفات پائی۔(۱)

فتاویٰ عالمگیری کی تدوین

اورنگ زیب عالمگیر کواللہ نے متنوع صلاحیتوں سے نوازا تھا، ایک جانب اگر وہ شمشیر وتلوار کا دھنی تھا تو دوسری جانب علوم وفنون میں بھی گہری مہارت رکھتا تھا، اگر اس کے لکھے رقعات فارسی ادب وانشا کی جان ہیں تو علم پروری میں بھی اس کا نمایاں حصہ ہے، عالمگیرؒ کے کارناموں میں ایک اہم اور نمایاں کارنامہ ''فتاویٰ عالمگیری'' کی تدوین وترتیب ہے۔

سلاطین مغلیہ عام طور پر علم دوست اور علم پرور تھے، ان کا کتب خانہ قیمتی کتابوں سے بھرا رہتا تھا، جس میں مختلف علوم وفنون پر نادر ونایاب کتب کی بہتات تھی، اگر غدر میں انگریزوں کے ہاتھوں یہ کتب خانہ نہ لٹتا تو دنیا کو نادر ونایاب کتب پر مشتمل ایک بہترین لائبریری ہاتھ آتی، اورنگ زیب عالمگیر شروع سے دینی مزاج رکھتے تھے؛ لہٰذا تخت اقتدار پر متمکن ہونے کے بعد انھوں نے اس شاہی لائبریری میں دینی علوم وفنون پر مشتمل کتابوں میں اضافہ کی جانب خاص توجہ کی اور بادشاہ کی توجہ دیکھ کر دنیا بھر سے علماء وفقہاء ان کے لئے دینی علوم وفنون پر مشتمل کتابوں کے تحائف لانے لگے۔

شاہی کتب خانہ سے اگرچہ کچھ علماء کو استفادہ کی اجازت تھی؛ لیکن استفادہ کی عام اجازت نہ تھی اور طباعت کی سہولت نہ ہونے کی وجہ سے کتابیں عام دسترس میں نہ تھیں، اس صورت حال میں سب سے زیادہ ابتری شاید محکمہ قضا میں تھی، جہاں قاضیوں کو مختلف مسائل ومشکلات کا سامنا کرنا پڑتا تھا، ایک تو ان کے پاس مناسب تعداد میں مستند فقہی کتابیں دستیاب نہ تھیں دوسرے ان کتابوں میں صرف معتبر اور مستند اقوال بیان نہیں کیے گیے تھے؛ بلکہ ان کتابوں میں ضعیف اور غیر مفتی بہ اقوال بھی ساتھ ساتھ نقل کیے گئے تھے، جس کی وجہ سے قانونی فیصلوں میں بڑی دقتیں پیش آ رہی تھیں، پہلی مرتبہ عالمگیر نے محکمہ قضا پر خاص توجہ دی اور قاضیوں کے فیصلے میں تضاد کو دُور کرنے کی سمت پہل کی۔

عالمگیرؒ نے فتاویٰ تاتارخانیہ کی طرح شخصی طور پر کسی عالم کو اس کام کی ذمہ داری دینے کے بجائے

(۱) نزہۃ الخواطر:۶/۷۳۷۔

مناسب سمجھا کہ پورے ملک سے فقہ وفتاویٰ میں ممتاز بلند مرتبت علماء وفقہاء کے اجتماع واشتراک سے یہ اہم کام کیا جائے، اس کے لئے عالمگیرؒ نے پوری دنیا سے فقہ حنفی کی مستند اور معتبر کتابوں کو جمع کیا اور ان کتابوں سے مفتی بہ، راجح اور مصلحت سے قریب مسائل جمع کرنے کا علماء کو حکم دیا؛ تاکہ شرعی احکام جاری کرنے میں قاضی اور مفتیان اسلام اس موضوع سے متعلق تمام کتب اور مختلف ذخائرِ فقہ کے تتبع اور تفحص سے بے نیاز ہو جائیں۔

اس عظیم کارنامے کی انجام دہی کے لیے عالمگیر نے شیخ نظام الدین برہان پوریؒ کی سرکردگی میں ایک جماعت تشکیل دی، فتاویٰ ہندیہ کے سلسلے میں کام کرنے والے علماء وفقہاء کے لئے عالمگیر نے گرانقدر وظائف متعین کیے اور ان کے لئے شاہی کتب خانہ سے کتابوں کی فراہمی کا بہترین انتظام کیا گیا۔(۱)

سن تالیف

فتاویٰ عالمگیری کی تصنیف وتالیف کا آغاز 1077ھ یا 1078ھ مطابق 1668ء یا 1669ء میں ہوا اور تکمیل 1085ھ یا 1086ھ مطابق 1676ء یا 1677ء میں ہوئی، جو تقریباً آٹھ سال کا عرصہ ہے، جیسا کہ محقق اہل علم وسوانح نگاروں نے ذکر کیا ہے، تفصیل کے لئے مولانا مجیب اللہ ندوی، مولانا صدر الحسن ندوی، ڈاکٹر علاء الدین خان ودیگر کی تصنیفات سے مراجعت کی جاسکتی ہے۔(۲)

اس کتاب کی تیاری میں تقریباً دولاکھ روپئے صرف ہوئے، جیسا کہ عالمگیر نامہ، مآثر عالمگیری، مرآۃ العالم کے مصنفین نے ذکر کیا ہے :

> چنانچہ قریب دولک روپیہ صرف لوازم ایں کتاب مستطاب کہ مسمی بفتاویٰ عالمگیریت گردیدہ۔(۳)

ترتیب فتاویٰ عالمگیری

فتاویٰ عالمگیری کی ترتیب ''ہدایہ'' کی ترتیب پر ہے، جیسا کہ اس کے مقدمہ میں لکھا ہے؛ البتہ ابواب

---

(۱) دیکھئے: عالمگیر نامہ، ص:۱۰۸۶، اور برصغیر میں علم فقہ، ص:۳۸۱۔

(۲) دیکھئے: فتاویٰ عالمگیری اور اس کے مؤلفین: ۲۲، اورنگ زیب اور تدوین فتاویٰ عالمگیری: ۳۹، عہد اورنگ زیب میں علماء کی خدمات: ۱/ ۲۳۱-۲۳۲، برصغیر میں علم فقہ: ۲۸۲۔

(۳) تفصیل کے لئے دیکھئے: عالمگیر نامہ: ۱۰۸۶-۱۰۸۷، مآثر عالمگیری: ۵۳۰، مرآۃ العالم: ۳۸۸۔

وفصول کی ترتیب اس طرح ہے کہ پہلے کتاب کا عنوان قائم کیا گیا ہے، اور یہ مرکزی عنوان ہوتا ہے، پھر اس موضوع کو مختلف ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے، پھر ہر باب میں آنے والے مسائل کی فصول میں تقسیم کی گئی ہے اور بالکل شروع میں مرکزی موضوع کی اصطلاحی تعریف نقل کرنے کا بھی اہتمام کیا گیا ہے، اس طرح اس کتاب میں بحیثیت مجموعی کتاب کی تعداد 61، ابواب کی تعداد 616، فصول کی تعداد 359، انواع کی تعداد 9، اوراقسام کی 9 ہیں۔

تعارف مخطوطات مراجع فقہیہ

فتاویٰ ہندیہ اوراس کے مآخذ ومراجع کے سلسلہ میں اہل علم نے کافی سیر حاصل بحث کی ہے؛ البتہ اس کے نمایاں امتیاز میں سے یہ ہے کہ اس کے مسائل فقہ حنفی اور علماء احناف کی ان قابل ذکر وقیع مآخذ ومراجع سے ماخوذ ہیں، جنھیں فقہ حنفی میں بڑی اہمیت حاصل ہے، اور وہ مسائل بہت ہی عام فہم، آسان اور سہل الفاظ میں ہیں، بقول علامہ شبلی نعمانیؒ: ''جو مسائل تمام کتبِ فقہ میں پیچیدہ الفاظ میں پائے جاتے ہیں، ان کو اس قدر آسان کر کے لکھا ہے کہ ایک بچہ تک سمجھ سکتا ہے''(۱) نیز اِس کتاب میں شاذ اور نادرالوقوع مسائل لینے سے حتی المقدور اجتناب کیا گیا ہے؛ البتہ اگر کہیں شاذ مسائل کے اندراج کے بغیر چارۂ کار نہ تھا تو انھیں کتاب میں ضرورتاً جگہ دی گئی ہے۔

ذیل میں فتاویٰ ہندیہ کے مآخذ ومراجع کا مختصر تعارف پیش خدمت ہے، ان مراجع میں بعض وہ ہیں جو اب تک مخطوطات کی شکل میں ہیں اور ان پر تحقیقی کام کرنے کی ضرورت ہے اور بعض وہ ہیں جن پر کسی ادارہ میں تحقیق وتعلیق کا کام ہو رہا ہے، اور کچھ وہ ہیں جو ابھی ماضی قریب میں تحقیق وتعلیق کے بعد زیورطبع سے آراستہ ہوکر منصۂ شہود پر آچکے ہیں، نیز ہندیہ کے مرتبین نے بعض مراجع کا ذکر کرنے میں پورا نام لکھنے کا التزام نہیں کیا ہے؛ بلکہ مختصر نام لکھ کر یا اصل نام کے بجائے کوئی اور معروف نام لکھ کر مرجع کا ذکر کیا ہے، مراجع کا تعارف کراتے ہوئے مکمل نام اور غیر مذکور اصل نام کی بھی وضاحت کی جائے گی، اسی طرح ان کتابوں کے بعض قلمی نسخے کا مقام، مکتبہ کا نام، محفوظہ نمبر بھی ذکر کیا جائے گا؛ تاکہ اگر کوئی صاحب علم ان مخطوطات پر تحقیق وتعلیق کا کام کرنا چاہے تو ان مخطوطات کو حاصل کرنا اور ان سے استفادہ کرنا سہل اور ممکن ہو۔

چوں کہ احقر اِدھر چند سالوں سے فتاویٰ عالم گیری پر دراسہ وتخریج مسائل کا کام کر رہا ہے، اس دوران

(۱) اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر: ۹۸۔

احقر کو بہت سے ان مکتبات کے مخطوطات کو دیکھنے اور ان سے استفادہ کرنے کا موقع ملا، جواب پی ڈی ایف کی شکل میں نیٹ پہ دستیاب ہیں، اور بعض مخطوطہ کے کئی کئی نسخے پی ڈی ایف کی شکل میں احقر کے پاس جمع ہو گئے ہیں؛ لہٰذا خواہش ہوئی کہ ان مخطوطات کی اہمیت وافادیت کو مدنظر رکھتے ہوئے ان کا مختصر تعارف تحریری شکل میں قارئین واہل علم کی خدمت میں پیش کروں؛ تاکہ فتاویٰ ہندیہ کے ایسے مراجع جو تا حال غیر مطبوعہ ہیں اور جن کے تعلق سے معلومات عام نہیں ہیں ان سے قارئین آگاہ ہو سکیں۔

☆ الکافی لحاکم شہید

فقہ حنفی میں کافی کے نام سے دو کتابیں مشہور ہیں، ایک محمد بن محمد بن احمد مروزی (متوفی: 334ھ) کی الکافی، (جن کی کنیت ابوالفضل ہے اور مشہور حاکم شہید سے ہیں)، دوسری علامہ ابوالبرکات عبداللہ بن احمد حافظ الدین نسفی متوفی: 710ھ کی الکافی، جو الوافی کی شرح ہے، حاکم شہید نے امام محمد کی کتابوں کو بنیاد بنا کر اس کی تالیف کی ہے؛ بلکہ انھوں نے امام محمد کی مبسوط اور جامع صغیر وکبیر کے مطولات ومکررات کو حذف کرتے ہوئے ان کے اہم مسائل کو اس میں یکجا کر دیا ہے، یہ کتاب مسلک احناف کے اُصولی ومعتمد مسائل کو نقل کرنے میں ایک عمدہ تصنیف ہے، مصنف علیہ الرحمہ کافی کے مقدمہ میں لکھتے ہیں کہ :

> میں نے اپنی اس کتاب میں امام محمدؒ کی کتابوں کے مطول مسائل کا اختصار کیا ہے اور مکررات کو حذف کر کے اہم مسائل کو اس میں جمع کر دیا ہے؛ اس غرض سے کہ ان سے استفادہ کرنا، مسائل کو یاد رکھنا آسان ہو اور کتاب کی خریداری کے خرچہ کے بوجھ سے بچا جا سکے اور اس کو پڑھنا اور سفر وحضر میں ساتھ رکھنا سہل ہو۔(۱)

اس کتاب کی متعدد علماء نے شرح لکھی ہے، جن میں سرفہرست علامہ سرخسیؒ ہیں، جن کی کتاب المبسوط ہے، علماء نے لکھا ہے کہ اگر ہدایہ اور اس کی شروحات میں مبسوط لکھ کر آئے تو اس سے یہی مبسوط مراد ہوتی ہے، علامہ سرخسیؒ کے علاوہ امام احمد بن منصور اسبیجابی متوفی: ۴۸۰ھ اور اسماعیل بن یعقوب انباری متوفی: ۳۳۱ھ نے بھی اس کی مفید شرحیں لکھی ہیں۔(۲)

---

(۱) الکافی، مقدمہ: ۱، مخطوط: مکتبہ سلیمانہ ترکی، حدیث نمبر: ۵۸۰۔

(۲) کشف الظنون: ۲/ ۱۳۷۸۔

اس کتاب کی ابوالبقاء محمد بن احمد بن ضیاء الدین قرشی متوفی : ۸۵۴ھ نے ''الشفاء فی اختصار الکافی'' کے نام سے تلخیص کی ہے، جس کا مخطوطہ مکتبہ خالدیہ بالقدس میں رقم: ۱۰۹/۲۴ سے محفوظ ہے۔(۱)

کافی کا مخطوطہ ان مندرجہ ذیل کتب خانوں میں بھی دستیاب ہیں :

1- مکتبہ سلیمانیہ، ترکی، مخطوطہ نمبر: ۵۸۰۔

2- مکتبہ فیض اللہ آفندی، ترکی، مخطوطہ نمبر: ۹۲۲-۹۲۳۔

3- مکتبہ داماد ابراہیم آفندی، ترکی، مخطوطہ نمبر: ۶۴۶۔

4- مکتبہ شستر بیتی، ہالینڈ، مخطوطہ نمبر: ۴۲۶۲۔

5- دار الکتب المصریہ، مصر، مخطوطہ نمبر: ۴۰۰۔

6- مکتبہ شہید علی، ترکی، مخطوطہ نمبر: ۹۱۲۔

اس کتاب پر جامعہ اسلامیہ مدینہ یونیورسٹی سے تحقیق کا کام ہورہا ہے۔

☆ التحریر فی شرح الجامع الکبیر

امام محمد بن حسن شیبانیؒ کی تصنیفات میں ایک اہم اور مشہور تصنیف الجامع الکبیر ہے، اس کتاب کی بہت سے اہل علم نے شروحات لکھی ہیں، جن میں سرفہرست شمس الائمہ ابومحمد بن عبدالعزیز حلوانی المتوفی: 449ھ، فقیہ ابو اللیث نصر بن احمد السمر قندی المتوفی: 373ھ، فخر الاسلام علی بن محمد البزدوی المتوفی: 482ھ، القاضی ابوزید عبیداللہ بن عمر الدبوسی المتوفی: 432ھ، الامام ابونصر احمد بن محمد بن عمر العتابی المتوفی: 586ھ، شمس الائمہ محمد بن احمد بن ابن سہل السرخسی المتوفی: 438ھ وغیرہ ہیں (۲)؛ البتہ ان شروحات میں سب سے نمایاں اور عمدہ شرح محمود بن احمد الحصیری المتوفی: 636ھ کی ہے، امام حصیری کا اہل علم کے نزدیک بڑا علمی مقام ہے، آپ بیک وقت محدث بھی تھے اور مفکر بھی، مفتی بھی تھے اور قاضی بھی، مجاہد بھی تھے اور مناظر بھی، آپ نے الجامع الکبیر کی دو شرحیں لکھیں، ایک مختصر شرح جو ''الوجیز'' کے نام سے معروف ہے، دوسری مفصل شرح جو ''التحریر'' کے نام سے مشہور ہے، (۳) مؤلف نے اس کتاب میں امام محمد کی ترتیب اور نہج سے الگ ایک انوکھا اور منفرد اُسلوب

(۱) تاریخ التراث العربی للسزکین: ۹۹/۳۔

(۲) کشف الظنون عن أسامی الکتب والفنون: ۵۶۹/۱۔

(۳) النجوم الزاہرۃ فی ملوک مصر والقاہرہ: ۳۱۳/۶۔

اختیار کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ اگر یمین وقسم سے متعلق کوئی مسئلہ کتاب کے جس باب میں ہو خواہ اس کا تعلق عبادات (نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج)، یا معاشرت (نکاح، طلاق، نفقات، وغیرہ) یا معاملات (خرید وفروخت)، یا فرائض ووصیت سے ہو، ان تمام کو ایک باب (یمین وقسم کے باب) میں جمع کر دیا ہے؛ اسی طرح کتاب الوکالہ یا اس طرح کے دوسرے ابواب سے متعلق تمام مسائل کو اسی باب میں جمع کر دیا ہے۔

مصنف نے ہر باب میں تفصیلی بحث کی ہے اور قرآن وحدیث اور آثار صحابہ سے اس کو مدلل کرنے کی کوشش کی ہے، اگر کسی مسئلہ میں اختلاف ہو تو اس کو اس کو کتاب وسنت اور قواعد فقہ کی روشنی میں کسی ایک کو ترجیح دے کر پیش کرتے ہیں، اس کتاب میں مصنف نے بکثرت اُصول کو ذکر کیا ہے، اس کتاب میں آنے والے تمام اُصول وقواعد کو دور حاضر کے ایک مشہور عالم دین علی احمد ندوی نے ''**القواعد والضوابط المستخلصة من التحریر**'' کے نام سے علی احمد ندوی نے ایک جگہ یکجا کر دیا ہے، علامہ حصیری نے مقدمہ میں اس کتاب اور اس کے منہج کے بارے میں جو وضاحت کی ہے اسے یہاں نقل کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے :

> رب دو جہاں کی رحمت کا محتاج یہ بندۂ ناتواں محمود بن احمد بن عبد السید حصیری (اللہ اس پر رحم کرے) عرض پرداز ہے : میں نے مباحث کو پھیلائے بغیر طوالت سے بچتے ہوئے اس کتاب کی شرح کی ہے، اس کا حجم تو زیادہ نہیں ہے پر اس میں علم بہت ہے، مسائل کی کثرت ہے، دلائل بھی وافر مقدار میں موجود ہیں، اس کتاب کی تالیف میں حد درجہ اختصار سے کام لیا گیا ہے، مجھ سے پہلے کئی مشہور علما وائمہ نے اس کتاب کی بے شمار شرحیں لکھی ہیں، مگر ان میں بعض نے حد سے زیادہ طوالت سے کام لیا اور بعض نے حد سے زیادہ اختصار سے، یہاں تک کہ تشنۂ تفصیل مقامات پر بھی اجمال سے کام لیا، اور بعض نے طوالت واختصار کے بجائے اعتدال کے ساتھ شرح کی، مگر انھوں نے تحقیق کا حق ادا نہیں کیا اور نہ ہی حسن ترتیب کی رعایت کی؛ لہٰذا مجھ سے درخواست کی گئی کہ میں الجامع الکبیر کی ایک دوسری شرح لکھوں، جو ہر اہم اور بلند مرتبت علم پر مشتمل ہو، جس میں اس کے معانی کی تشریح اور اس کے الفاظ کی تنقیح ہو، اور یہ کہ دیگر کتابوں میں موجود اس کے مشابہ مسائل کو بھی اس میں جمع کروں؛ تا کہ اس سے

استفادہ آسان ہو اور اس کی بنیاد میں پختگی پیدا ہو، اور یہ کہ میں تعدد طرق اور تفصیلی عبارتوں کے ذریعہ مسائل کی وضاحت کروں، اختلافی مسائل اور مختار اقوال کی تشفی بخش دلائل اور کتبِ فقہ میں درج عبارتوں کے ذریعہ تحقیق کروں، یہ درخواست ایسے شخص کی طرف سے کی گئی جس کا میرے ساتھ اچھا تعلق ہے، جس کی وجہ سے میں اس سے معذرت نہیں کرسکا؛ چنانچہ میں نے اجر کثیر اور نیک نامی کی اُمید میں اس کی درخواست قبول کی، اور اس کے دل کی تشنگی کا سامان کر دیا، میں نے اس کا نام ''التحریر فی شرح الجامع الکبیر'' رکھا، اللہ اس کی تکمیل کی توفیق عطا فرمائے اور آسانی کے ساتھ کام کو انجام تک پہنچائے، وہ ہمارے لیے کافی ہے اور بہتر کارساز ہے۔(۱)

فتاویٰ ہندیہ میں اس کتاب کے ۸۰/ سے زائد حوالہ جات آئے ہیں، اس کتاب کے مخطوطے درج ذیل کتب خانوں میں ہیں:

7- مکتبہ نور عثمانیہ، ترکی، مخطوطہ نمبر: 1580-1581۔
8- مکتبہ فیض اللہ آفندی، ترکی، مخطوطہ نمبر: 948-751۔
9- مکتبہ جار اللہ آفندی، ترکی، مخطوطہ نمبر: 670-671۔
10- مکتبہ راغب پاشا، ترکی، مخطوطہ نمبر: 514 تا 517۔
11- مکتبہ عاطف آفندی، ترکی، مخطوطہ نمبر: 859-860۔

نیز ان کے علاوہ بھی بہت سے کتب خانوں میں اس کے مخطوطات دستیاب ہیں، اس کتاب پر جامعہ اسلامیہ مدینہ یونیورسٹی سے تحقیق کا کام ہو رہا ہے۔

☆ التنویر فی شرح تلخیص الجامع الکبیر

الجامع الکبیر کی جس طرح متعدد شروحات لکھی گئی ہیں، اسی طرح اس کی تلخیص بھی کی گئی ہے، جن میں مشہور تلخیص شیخ جمال الدین محمد بن عباد الخلاطی المتوفی: 652ھ کی ہے، (۲) اس تلخیص کی بھی بہت سے اہل علم نے

(۱) التحریر شرح الجامع الکبیر، مقدمہ: ۱/۱، مخطوط: مکتبہ راغب پاشا، ترکی مخطوطہ نمبر: ۵۱۴۔
(۲) ہدیۃ العارفین: ۲/۱۲۵۔

شرحیں لکھی ہیں، جن میں سرفہرست علی بن بلبان الفارسی المتوفی: 731ھ کی ''تحفۃ الحریص شرح تلخیص الجامع الکبیر'' (۱)، سعدالدین مسعود بن عمر التفتازانی کی ''التمحیص شرح تلخیص الجامع الکبیر'' وغیرہ ہیں، انہی شروحات میں سے ایک شرح ابوالعصمۃ مسعود بن محمد الغجد وانی المتوفی: 772ھ کی ''التنویر فی شرح تلخیص الجامع الکبیر'' ہے (۲)، آپ نے اس شرح کو لکھنے میں اس بات کا خیال رکھا ہے کہ تلخیص میں جہاں مسائل پیچیدہ تھے یا ایسے رموز و الفاظ استعمال ہوئے تھے جن کو سمجھنا مشکل تھا اس کو آسان، واضح انداز میں خوش سلیقگی کے ساتھ پیش کیا ہے (۳)، فتاویٰ ہندیہ میں 22/مقامات پر اس کے حوالے آئے ہیں، اس کتاب کے مخطوطے درج ذیل کتب خانوں میں موجود ہیں :

1- مکتبہ سلیمانیہ، ترکی، مخطوطہ نمبر: 459۔
2- مکتبہ فیض اللہ آفندی، ترکی، مخطوطہ نمبر: 746، 757-758۔
3- مکتبہ شہید علی، ترکی، مخطوطہ نمبر: 799-801۔
4- مکتبہ سرای أحمد الثالث، ترکی، مخطوطہ نمبر: 734-736۔
5- مکتبہ لالہ لی، ترکی، مخطوطہ نمبر: 967۔

اس کتاب پر کلیۃ الامام الاعظم بغداد میں تحقیق کا کام ہو رہا ہے۔

☆ شرح الزیادات للعتابی

الزیادات امام محمدؒ کی چھ مشہور تصانیف میں سے ایک ہے، اس کتاب کی شرح متعدد صاحبان علم نے کی ہے، جن میں حسن بن منصور الأوزجندی قاضی خان المتوفی: 592ھ، أبوحفص سراج الدین عمر بن اسحاق الہندی المتوفی: 773ھ جیسے نامور فقہاء شامل ہیں (۴)، انہی میں سے ایک ابونصر احمد بن محمد العتّابی ہیں، آپ متقی، پرہزگار ہونے کے ساتھ ساتھ علم دین کے بڑے عالم تھے، آپ نے زیادات کی شرح بہت ہی محققانہ طرز پر کی اور ایسے نادر نکات وفوائد اس کتاب میں مذکور ہیں جو شاید ہی دوسری کتابوں میں ملیں (۵)، آپ نے اس شرح کا سبب بیان کرتے ہوئے لکھا ہے :

(۱) الفوائد البھیۃ فی تراجم الحنفیۃ: ۱۱۸۔ (۲) کشف الظنون عن أسامی الکتب والفنون: ۱/ ۴۷۲۔
(۳) التنویر فی شرح تلخیص الجامع الکبیر، مقدمہ: ۱/ ۱، مخطوط: مکتبہ فیض اللہ آفندی، ترکی۔
(۴) کشف الظنون عن أسامی الکتب والفنون: ۲/ ۹۶۲۔ (۵) الفوائد البھیۃ فی تراجم الحنفیۃ: ۳۶۔

جب میں نے اپنے زمانہ کے اہل علم کو ہر چیز کی تلخیص و اختصار کرتے ہوئے دیکھا تو اس چیز نے مجھ کو اس بات پر آمادہ کیا کہ میں بھی زیادات کی ایک ایسی تلخیص قلمبند کروں جو نکات وعبارات کا خلاصہ ہو اور معانی وارشادات کا مجموعہ ہو؛ چنانچہ میں نے اس کے مشکل ترین مسائل کو بیان کرنے میں تفصیل سے اور آسان مسائل کی وضاحت میں اختصار سے کام لیا۔

آپ کی وفات 586ھ کو بخاریؒ میں ہوئی اور کلاباذ کے اس مقبرہ میں مدفون ہوئے جہاں سات قاضی مدفون ہیں، فتاویٰ ہندیہ میں اس کتاب کے 33/حوالے آئے ہیں، اس کتاب کے مخطوطے درج ذیل مکتبات میں ہیں :

1- مکتبہ فیض اللہ آفندی، ترکی، مخطوطہ نمبر: 763۔
2- مکتبہ شستر بیتی، آیرلینڈ، مخطوطہ نمبر: 3018/ 1-73/ 3۔
3- مکتبہ الجامعہ الاسلامیہ، سعودی عربیہ، مخطوطہ نمبر: 2946۔
4- مکتبہ الاسد، شام، مخطوطہ نمبر: 5594۔
5- مکتبہ الخالدیہ، فلسطین، فقہ، مخطوطہ نمبر: 608، 666۔

☆ الواقعات الحسامية

اس کتاب کے مصنف عمر بن عبدالعزیز بن عمر بن مازہ متوفی: 536ھ ہیں، آپ کی کنیت ابومحمد، لقب حسام الدین ہے، اور ''صدر شہید'' کے لقب سے معروف ہیں، آپ اپنے زمانہ کے بڑے امام اور مشرق ومغرب کے مفتی تھے، آپ کی ذات مختلف علوم وفنون کی جامع تھی آپ بیک وقت محدث، فقیہ، اُصولی اور مناظر بھی تھے آپ اُصول وفروع میں امام اور منقول ومعقول کے بڑے عالم تھے، مختلف فیہ مسائل کے بڑے عالم تھے۔(۱)

''الواقعات'' کے نام سے کئی کتابیں لکھی گئی ہیں، جن میں علامہ احمد بن محمد بن عمر الناطقی المتوفی: 442ھ کی خزانۃ الواقعات، امام افتخار الدین طاہر بن احمد البخاری المتوفی: 542ھ کی خزانۃ الواقعات اور احمد بن ناصر القلانسی المتوفی: 1132 کی تہذیب الواقعات وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

(۱) الفوائد البھیۃ فی تراجم الحنفیۃ: ۱۴۹، نیز دیکھئے: الواقعات الحسامیۃ، مقدمہ: ۱، نیز دیکھئے: کشف الظنون عن أسامی الکتب والفنون: ۲/ ۱۹۹۸۔

آپ کی یہ کتاب ''الاجناس'' اور ''واقعات الحسامی'' کے نام سے بھی مشہور ہے، آپ نے اس کتاب میں ان مسائل کو جمع کرنے کا التزام کیا ہے جس میں عموم بلوی تھا، نیز آپ نے فقیہ ابواللیث سمرقندی کی ''کتاب النوازل''، اور ''عیون المسائل''، شیخ ابو العباس الناطفی کی ''خزانۃ الواقعات''، امام ابوبکر محمد بن فضل اور علماء سمرقند کے فتاوی کے منتخب مسائل کو اس میں یکجا کردیا ہے، نیز آپ نے اس کتاب کی ترتیب حاکم شہید کی ''مختصر الکافی'' کی ترتیب پر رکھی، اور ابواب کی ترتیب علامہ سمرقندی کی ''کتاب النوازل'' پر رکھی ہے، اور جہاں ابواب میں اضافہ محسوس کیا تو وہاں اضافہ بھی کیا ہے، اور جس کتاب سے بھی کسی مسئلہ کو اخذ کیا تو اس کتاب کا نام ذکر کرنے کے بجائے اس کے لئے ایک علامت اور رمز کا استعمال کیا ہے؛ چنانچہ وہ رموز اس طرح ہیں :

- ''ن'' : کتاب النوازل کے لئے۔
- ''ع'' : عیون المسائل کے لئے۔
- ''ب'' : امام ابوبکر کے مسائل کے لئے۔
- ''س'' : فتاوی اہل سمرقند کے لئے۔(۱)

فتاویٰ ہندیہ میں اس کتاب کے متعدد حوالے آئے ہیں، اس کتاب کے مخطوطے درج ذیل مکتبات میں ہیں :

1- مکتبہ فیض اللہ آفندی، ترکی، مخطوطہ نمبر: 1086۔
2- مکتبہ وہبی آفندی، مخطوطہ نمبر: 573۔
3- مکتبہ ینی جامع، ترکی، مخطوطہ نمبر: 689-690۔
4- مکتبہ شہید علی، ترکی، مخطوطہ نمبر: 1085۔
5- مکتبہ سلطان محمد فاتح، ترکی، مخطوطہ نمبر: 2491-2492۔(۲)

☆ الفتاویٰ الکبری

صدر الشہید کی تصانیف میں سے ایک اہم تصنیف الفتاویٰ الکبری ہے، اسی نام سے علامہ رملی شافعیؒ

(۱) الواقعات الحسامیۃ، مقدمہ: ۱، مخطوط: مکتبہ فیض اللہ آفندی، ترکی، نیز دیکھئے: کشف الظنون: ۲/ ۱۹۹۸۔
(۲) معجم تاریخ التراث الاسلامی فی مکتبات العالم، المخطوطات والمطبوعات: ۳/ ۲۲۷۵۔

اور علامہ ابن تیمیہؒ نے بھی فتاویٰ کی کتاب تصنیف کی ہے، اس کتاب کی جمع وتدوین اور تبویب کا کام قاضی نجم الدین یوسف بن احمد الخاصی الخوارزمی المتوفی: 634ھ نے کیا؛ چوں کہ صدر الشہیدؒ نے اس کتاب کی ترتیب وتبویب پر اتنی زیادہ توجہ نہیں دی جتنی ''الواقعات'' میں دی؛ البتہ اس کتاب میں بھی آپ نے انہی کتابوں سے استفادہ کیا ہے جن کتابوں سے ''الواقعات'' میں استفادہ کیا، یعنی آپ نے فقیہ ابو اللیث سمرقندی کی ''کتاب النوازل'' اور ''عیون المسائل''، شیخ ابو العباس الناطفی کی ''خزانۃ الواقعات''، امام ابوبکر محمد بن فضل اور علماء سمرقند کے فتاویٰ سے استفادہ کیا ہے اور ہر کتاب کے لئے ایک مخصوص رمز کا استعمال کیا ہے؛ چنانچہ کتاب النوازل کے لئے ''ن''، عیون المسائل کے لئے ''ع''، امام ابوبکر کے مسائل کے لئے ''ب'' اور فتاوی اہل سمرقند کے لئے ''س'' کا استعمال کیا ہے، (۱) فتاویٰ ہندیہ میں اس کتاب کے تقریباً ڈیڑھ سو مسائل لئے گئے ہیں، اس کتاب کے مخطوطات درج ذیل کتب خانوں میں دستیاب ہیں :

1- مکتبہ فیض اللہ آفندی، ترکی، مخطوطہ نمبر: 1086۔

2- مکتبہ وہبی آفندی، مخطوطہ نمبر: 573۔

3- مکتبہ ینی جامع، ترکی، مخطوطہ نمبر: 689-690۔

4- مکتبہ شہید علی، ترکی، مخطوطہ نمبر: 1085۔

5- مکتبہ سلطان محمد فاتح، ترکی، مخطوطہ نمبر: 2491-2492۔ (۲)

اس کتاب پہ جامعۃ العلوم الاسلامیہ عمان کے شعبہ تخصص فی الفقہ واُصولہ سے اس کتاب پہ تحقیق کا کام ہورہا ہے۔

☆ الفتاویٰ الصغریٰ

صدر الشہید کی ایک اور اہم فقہی تصنیف الفتاویٰ الصغری ہے (۳)، اس کتاب کی ترتیب وتبویب پر مصنفؒ نے زیادہ توجہ نہیں دی؛ بلکہ اس کی ترتیب وتبویب کا فریضہ قاضی نجم الدین یوسف بن احمد الخاصی

(۱) کشف الظنون عن أسامی الکتب والفنون: ۲/ ۱۲۲۸۔

(۲) معجم تاریخ التراث الاسلامی فی مکتبات العالم، المخطوطات والمطبوعات: ۳/ ۲۲۷۔

(۳) تاریخ التراجم لابن قطلوبغا: ۲۱۸۔

الخوارزمی المتوفی:634ھ نے انجام دیا(۱)،فتاویٰ ہندیہ میں اس کتاب کے متعدد حوالے آئے ہیں،اس کتاب کے مخطوطے دنیا کے ان کتب خانوں میں موجود ہیں :

1- مکتبہ فیض اللہ آفندی،ترکی،مخطوطہ نمبر:1047۔
2- مکتبہ یازمافقیہ،ترکی،مخطوطہ نمبر:58۔
3- مکتبہ ینی جامع،ترکی،مخطوطہ نمبر:639-640۔
4- خدابخش لائبریری پٹنہ،انڈیا،مخطوطہ نمبر:1/98،991۔
5- مکتبہ سلیم آغا،ترکی،مخطوطہ نمبر:434۔(۲)

اس کتاب پر تحقیق کا کام مرکز البحوث الاسلامیۃ استانبول ترکی میں ہو رہا ہے۔

☆ شرح الجامع الصغیر لحسام الدین

الجامع الصغیر کی شرح بہت سے اہل علم نے لکھی ہے،ان شارحین میں صدر الشہید بھی ہیں،آپ کی یہ شرح ایک مختصر مگر عمدہ اور نفع بخش شرح ہے،حضرت مولانا عبدالحی لکھنوی آپ کی اس شرح کے تعلق سے لکھتے ہیں :

قد طالعت شرحہ للجامع الصغیر وھو شرح مختصر مفید ۔ (۳)

الجامع الصغیر کی شروحات میں بعض شرحوں کو بہت ہی معتبر سمجھا گیا ہے،جن کے مصنفین یہ ہیں :

1- ابوالليث نصر بن محمد بن ابراہیم بن الخطاب السمرقندی،متوفی:373ھ۔
2- امام فخر الدین حسن بن منصور اوزجندی(معروف بقاضی خان)متوفی:592ھ۔
3- احمد بن علی بن ابوبکر رمحمد البغدادی المعروف بالجصاص الرازی،متوفی:370ھ۔
4- عمر بن عبدالعزیز بن عمر بن مازہ ابومحمد حسام الدین،المعروف بالصدر الشہید۔
5- امام برہان الدین ابوالمعالی محمود بن الصدر الشہید تاج الدین احمد بن برہان عبدالعزیز بن عمر البخاری المعروف بابن مازہ،متوفی:616ھ۔
6- امام ابونصر احمد بن محمد عتابی بخاری متوفی:586ھ۔

---

(۱) کشف الظنون عن أسامی الکتب والفنون:۲/ ۱۲۲۴۔

(۲) معجم تاریخ التراث الاسلامی فی مکتبات العالم،المخطوطات والمطبوعات:۳/ ۲۲۷۵،نیز دیکھئے:خزانۃ التراث، فہرس مخطوطات:۵۷/ ۲۷۶۔ (۳) الفوائد البہیہ فی تراجم الحنفیۃ:۱۴۹۔

7- امام ظہیر الدین احمد بن اسماعیل تمرتاشی متوفی: 601ھ۔

8- احمد بن منصور القاضی ابونصر الاسبیجابی، متوفی: 480ھ۔

ومن الكتب المعتبرة : (الشروح السبعة للجامع الصغير) لأبي الليث السمرقندي ، ولقاضي خان ، وللحسامي ، وللبرهاني ، وللصدر الشهيد ، وللعتأبي ، وللتمرتاشي ، وقد ذكر أكثر هؤلاء . (۱)

صدر الشہیدؒ نے الجامع الصغیر کی کتنی شرحیں لکھیں، اوران کے نام کیا ہیں؟ اس سلسلہ میں مختلف آراء ہیں :

1- حاجی خلیفہ، اسماعیل پاشا، علامہ قرشی اور علامہ زرکلی کی رائے یہ ہے کہ آپ نے الجامع الصغیر پر دو کتابیں تصنیف کیں، ایک: مطول، جس کو جامع الصدر الشہید کہا جاتا ہے، دوسری: المختصر، جس کو شرح الجامع الصغیر کہا جاتا ہے۔(۲)

2- علامہ لکھنویؒ نے ملاعلی قاریؒ سے یہ بات نقل کی ہے کہ صدر الشہید نے تین شرحیں لکھی ہیں، ایک: مطول، دوسری: متوسط، اور تیسری: مختصر۔(۳)

3- بروکلمان کی رائے یہ ہے آپ نے ایک کتاب لکھی، اس کا نام ترتیب الجامع الصغیر ہے، (۳) اورفوادسزکین کی رائے یہ ہے کہ آپ نے تہذیب الجامع الصغیر کے نام سے ایک کتاب لکھی، پھر جامع الصدر الشہید کے نام سے اس کی شرح لکھی۔(۴)

لیکن مصنفؒ شرح الجامع الصغیر کے مقدمہ میں خود لکھتے ہیں کہ ہمارے مشائخ نے الجامع الصغیر کو بڑی اہمیت دی ہے، اوراس کو تمام کتابوں پر مقدم رکھا ہے، یہاں تک کہ انھوں نے فرمایا کہ کسی کے لئے فتویٰ دینا یا فیصلہ کرنا اس وقت تک جائز نہیں، جب تک کے اسے اس کتاب کے مسائل حفظ نہ ہوں؛ اس لئے کہ اس کتاب کے مسائل ہمارے اصحاب کے مسائل کی بنیاد ہیں۔

---

(۱) مفتاح السعادۃ: ۲/ ۲۵۶، نیز دیکھئے: الجواہر المضیۃ: ۲/ ۴۴۹، البدور المضیۃ فی تراجم الحنفیۃ: ۱۵/ ۱۵۶۔

(۲) الفوائدالبہیہ: ۱۴۹، کشف الظنون: ۱/ ۵۶۳، ہدیۃ العارفین: ۱/ ۷۸۳، الجواہر المضیۃ: ۲/ ۶۴۹، النافع الکبیر: ۵۳۔

(۳) الفوائدالبہیہ فی تراجم الحنفیۃ: ۱۴۹۔

(۴) تاریخ التراث العربی: ۳/ ۲۲۷۳۔

مزید لکھتے ہیں کہ ہمارے بعض احباب نے مجھ سے خواہش کی کہ میں الجامع الصغیر کے مسائل کو اختصار کے ساتھ قاضی ابوزید دبوسی کی ترتیب پر مرتب کردوں، اور مختلف آراء، احادیث اور ان کی شرحوں کو چھوڑ دوں؛ چنانچہ میں نے ان کی اس درخواست کو قبول کیا، پھر بعض ان احباب نے جن کو یہ تلخیص کافی نہیں تھی، مجھ سے یہ درخواست کی کہ میں ایک دوسری کتاب مرتب کروں اور اس میں روایات واحادیث اور بعض شرحوں کا اضافہ کروں؛ چنانچہ ان کی بھی اس درخواست کو قبول کیا۔(۱)

معلوم ہوا کہ صدرالشہید نے الجامع الصغیر کی دو شرحیں لکھیں، ایک مطول اور دوسرا مختصر، نیز ان دونوں کے درج ذیل نام کتابوں میں ملتے ہیں :

1- جامع الصدرالشہید۔
2- تہذیب الجامع الصغیر۔
3- شرح الجامع الصغیر۔
4- فوائدالجامع الصغیر۔
5- ترتیب الجامع الصغیر۔

فتاویٰ ہندیہ میں اس کتاب سے کئی مسائل لئے گئے ہیں، نیز اس کتاب پر جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کے ایک طالب علم سعید بونا دابو نے شیخ عبداللہ بن احمد قادری الاہدل کی نگرانی میں سنہ 1413-1414ھ میں تحقیق ودراسہ کا کام کیا ہے۔

اس کتاب کے قلمی نسخے مندرجہ ذیل مکتبات میں ہیں :

1- مکتبہ مرادملا، ترکی، مخطوطہ نمبر:840۔
2- مکتبہ فیض اللہ آفندی، ترکی، مخطوطہ نمبر:747۔
3- خدابخش لائبریری، پٹنہ، مخطوطہ نمبر:1593۔
4- مکتبہ جاراللہ آفندی، مخطوطہ نمبر:665-664۔
5- مکتبہ شہیدعلی ترکی، مخطوطہ نمبر:791۔

---

(۱) شرح الجامع الصغیر مطول، مقدمہ:۲، مکتبہ مرادملا ترکی، مخطوطہ نمبر:۸۴۰۔

☆ العدة فی الفتاویٰ

فتاویٰ لکھنے اور جمع کرنے کا کام بہت سے اہل علم نے کیا، جن میں بعض کتب فتاویٰ ضخیم ہیں اور کئی کئی جلدوں پر مشتمل ہیں اور بعض مختصر ہیں اور ایک جلد میں فقہ کے تمام ابواب کا احاطہ ہے، صدر الشہیدؒ نے بھی کئی اہم کتب فتاوی تصنیف کیں، ان میں سے ایک مختصر تصنیف ''العدہ فی الفتاویٰ'' ہے، (۱) اس میں مصنف نے اختصار کے ساتھ نادر و اہم مسائل کو جمع کر دیا ہے؛ چنانچہ آپ اس کتاب کے مقدمہ میں لکھتے ہیں :

> میں نے فتاویٰ کے مطالعہ کے دوران یہ بات پائی کہ ان میں بعض مسائل ایسے ہیں جو مختلف المعانی ہیں اور اس زمانہ میں وہ متداول نہیں ہیں، ان کے الفاظ قدیم ہیں جو زبان زد نہیں ہیں، ان کے مآخذ تک رسائی ممکن نہیں ہے، نیز طبیعت ان کو رد کرتی ہے اور ذہن ان کو قبول کرنے سے قاصر ہے، دیکھنے والا ان سے اُکتا جاتا ہے؛ لیکن اس کے باوجود اس میں بہت سے ایسے فوائد ہیں، جو زخم کے لئے مرہم کی حیثیت رکھتے ہیں، جن سے صرف نظر کرنا جائز نہیں، ان کے جوابات آسان ہیں، اس شخص کے لئے جن کے دل کو اللہ نے اپنے ذکر سے آزمایا اور اس کے دل کو اپنے حکم کی بجا آوری کے لئے کھول دیا؛ چنانچہ میں نے ان مسائل کی تلخیص کی اور چھانٹ پھٹک کر ان مسائل کی طرف رہنمائی کی جن پر اعتماد کرنا صحیح ہے اور جن کا سہارا لینا جائز ہے، نیز میں نے اس میں ایجاز سے کام لیا ہے۔(۲)

یہ کتاب جملہ چالیس اوراق پر مشتمل ہے، اس کتاب کے قلمی نسخے دنیا کے بہت کم مکتبات میں دستیاب ہیں، فتاویٰ ہندیہ جلد:۱/ ۴۱۳ میں اس کتاب سے ایک مسئلہ لیا گیا ہے، اس کتاب پر اب تک تحقیق کا کام نہیں ہوا ہے، اس کتاب کے قلمی نسخے درج ذیل مکتبات میں دستیاب ہیں :

1- مکتبہ فاضل احمد، ترکی، مخطوطہ نمبر: ۶۸۹۔
2- مکتبہ فیض اللہ آفندی، ترکی، مخطوطہ نمبر: ۱۰۳۵۔
3- مکتبہ اسعد آفندی، ترکی، مخطوطہ نمبر: 1108۔

---

(۱) البحر الرائق، مقدمہ: ۱/ ۳۔ (۲) العدۃ فی الفتاویٰ، مقدمہ: ۱، مخطوطہ: مکتبہ فاضل احمد، ترکی۔

☆ البرجندی شرح النقایہ مختصر الوقایہ

البرجندی: یہ النقایہ (جو مختصر الوقایہ کی تلخیص ہے) کی شرح ہے، اس کے مصنف عبد العلی بن محمد بن حسین البرجندی المتوفی: 932ھ ہیں، النقایہ کی شرح بہت سے اہل علم نے لکھی ہے، جن میں مشہور احمد بن محمد الشمنی المتوفی: 872ھ کی مال الدرایۃ فی شرح النقایۃ، ابوالمکارم بن عبداللہ بن محمد المتوفی: 907ھ کی شرح النقایۃ لابی المکارم، محمود بن الیاس الرومی المتوفی: 851ھ شرح الیاس علی النقایۃ، شمس الدین: محمد الخراسانی ثم القہستانی المتوفی: 962ھ کی جامع الرموز، نور الدین علی بن سلطان محمد القاری الہروی المتوفی: 1014ھ کی فتح باب العنایۃ شرح النقایۃ وغیرہ بہت مشہور شروحات ہیں، ان کے علاوہ بھی بہت سے اہل علم نے اس کی شرح لکھی ہے،(۱) البرجندی بھی انہی شروحات میں سے ایک ہے، اس شرح کو قاسم بن قطلو بغا نے لکھنا شروع کیا تھا؛ لیکن ان کی زندگی نے وفا نہیں کی اور وہ اس شرح کو مکمل نہیں کر سکے، بعد میں اس کو عبد العلی بن محمد بن حسین البرجندی المتوفی: 932ھ نے قسطنطنیہ میں مکمل کیا،(۲) عبد العلی البرجندی کو مختلف علوم میں مہارت حاصل تھی، آپ اُصولی، فقیہ، اور ماہر فلکیات وریاضیات تھے۔(۳)

اس کتاب کے مقدمہ میں مصنف نے لکھا ہے کہ میں نے اس شرح میں نقایہ کے پیچیدہ مسائل، ان کی علل ووجوہات کو اجاگر کیا ہے، فقہی قواعد کو تحریر کیا ہے، مجملات کو مفصل کیا ہے، اسرار ورموز کو تفصیل سے بیان کیا ہے (۴)، یہ نقایہ کی شروحات میں بہت ہی جامع اور مفصل شرح ہے، فتاویٰ ہندیہ میں اس کے حوالے 12 رمقامات پر آئے ہیں۔

اس کتاب کا مخطوطہ دنیا کے مختلف مکتبات میں دستیاب ہے، جن میں سے بعض مشہور مکتبات کے نام، مقام، اور مخطوطہ نمبر درج ذیل ہیں :

1- مکتبہ راغب پاشا، ترکی، مخطوطہ نمبر: 569۔

2- مکتبہ کوبریلی، ترکی، مخطوطہ نمبر: 614۔

---

(۱) کشف الظنون عن أسامی الکتب والفنون: ۲/ ۱۹۷۲، نیز دیکھئے: الفوائد البہیہ فی تراجم الحنفیۃ: ۱۱۲۔

(۲) الأعلام للزرکلی: ۴/ ۳۰۔

(۳) معجم المطبوعات العربیۃ والمعربۃ: ۲/ ۵۴۷۔

(۴) البرجندی شرح النقایۃ، مقدمہ: ۱/ ۱، مخطوط: مکتبہ راغب پاشا، ترکی۔

3- مکتبہ ملک عبدالعزیز ریاض سعودی عربیہ، مخطوطہ نمبر:4134۔

4- رضالائبریری رامپورانڈیا، مخطوطہ نمبر:1/210(283،284)،2/344،2/651۔

5- دارالعلوم الاسلامیہ، پاکستان، مخطوطہ نمبر:5976۔

☆ السراج الوھاج شرح مختصر القدوری

السراج الوہاج یہ مختصر القدوری کی ایک مفصل شرح ہے، اس کو علامہ ابوبکر بن علی الحدادی الزبیدیؒ المتوفی:800ھ نے تالیف کیا ہے، جو آٹھ جلدوں پر مشتمل ہے،(۱) اس کتاب کی ضخامت کی وجہ سے صاحب کتاب نے خود اس کی تلخیص الجوہرۃ النیرۃ کے نام سے دوجلدوں میں کی ہے جو طبع ہوچکی ہے، اسی طرح اس کی ایک تلخیص ''البحر الزاخر فی تجرید السراج الوہاج'' کے نام سے ایک جلد میں ہے؛ اگرچہ اہل علم نے ''السراج الوہاج'' کو غیر متداول، ضعیف اور غیر معتبر قرار دیا ہے(۲)؛ لیکن مؤلفؒ نے اس کتاب کے بارے میں لکھا ہے کہ میں نے اس کتاب کے اندر قدوری کے مشکل وگنجلک مسائل کو واضح کیا ہے، ان کی پیچیدگیوں کو بیان کیا ہے، مسائل کی وضاحت میں میانہ روی اور اعتدال سے کام لیا ہے یعنی اختصار کی جگہ اختصار اور تفصیل کی جگہ تفصیل کی ہے، نیز اس کتاب میں میں نے چنیدہ، منتخب، مفید اور جامع الفاظ ومعانی کو جمع کیا ہے، ماخذ ومراجع کو سہل کیا ہے؛ تاکہ طالب علم کے لئے استفادہ آسان ہو۔(۳)

فتاویٰ ہندیہ میں اس کتاب کے بکثرت حوالے آئے ہیں، اس کتاب کے مخطوطے دنیا کے کئی کتب خانوں میں دستیاب ہیں، جن میں سے بعض کے نام، مقام اور مخطوطہ نمبر مندرجہ ذیل ہیں :

1- مکتبہ کوبریلی، ترکی، مخطوطہ نمبر:591-594۔

2- مکتبہ اسعد آفندی، ترکی، مخطوطہ نمبر:716-718۔

3- مکتبہ الحرم المکی سعودی عربیہ، مخطوطہ نمبر:1910-1913۔

4- مکتبہ دارالکتب الظاہریہ، دمشق، مخطوطہ نمبر:2534-2537۔

5- مکتبہ آصفیہ حیدرآباد، فقہ، مخطوطہ نمبر:66-68 جزء:1-3941۔

---

(۱) الأعلام للزرکلی: ۲/ ۶۷۔

(۲) کشف الظنون عن اسامی الکتب والفنون: ۲/ ۱۶۳۔

(۳) مستفاد: السراج الوہاج، مقدمہ: ۱/۱، مخطوط: مکتبہ کوبریلی، ترکی۔

☆ البحر الزاخر فی تجرید السراج الوہاج

السراج الوہاج کی تلخیص مصنفؒ نے خود کی ہے اور دوسری شیخ احمد بن محمد بن اقبالؒ نے مذکورہ بالا نام سے کی ہے(۱)، اس کتاب کا مخطوطہ مکتبہ حرم مکی سعودیہ میں ہے، اور مکمل ہے، اور رقم الحفظ :80(حنفی دہلوی) ہے ،اس مخطوطہ کے آخر میں ناسخ کا نام درج ہے، جو صفی الدین الحکری ہے، نیز اس کے پہلے صفحہ کے بالائی حصہ پر یہ تحریر ہے :

المسمی بالبحر الزاخر والله أعلم كذا سمعت من شيخ جمال مكي ، وهذا الكتاب البحر الزاخر تجريد السراج الوهاج للشيخ الفقيه أحمد بن إقبال ۔ (۲)

اس کے علاوہ رضا لائبریری رامپور [D3297(2213)-273و] اور جامعہ ازہر (81453 الاتراک) میں بھی اسی نام سے مخطوطہ ہے، جس کا ذکر خزانۃ التراث، الفہرس الشامل (۳) اور فہرست جامعہ ازہر میں ہے؛ لیکن وہ مخطوطہ اس کے علاوہ ہے اور اس کے مصنف کا نام عبد العلیم بن اقبال قربتی یمنی ہے اور اس مخطوطہ کا مکمل نام ''البحر الزاخر فی شریعۃ المطہر الطاہر'' ہے (۴)، فتاویٰ عالم گیری کتاب الطلاق میں اس کتاب سے ایک مسئلہ لیا گیا ہے۔

☆ الوافی

یہ کتاب امام ابوالبرکات عبداللہ بن احمد بن محمود حافظ الدین النسفیؒ کی ہے، آپ کی وفات ۷۱۰ھ میں ہوئی، آپ کی یہ کتاب متون کے درجہ میں ہے اور بہت ہی مقبول اور معتبر ہے، آپ نے اپنی اس کتاب میں امام محمد کی الجامع الصغیر، الجامع الکبیر، الزیادات اور بعض فتاویٰ وواقعات کی کتابوں سے اہم مسائل کو اختصار کے ساتھ جمع کر دیا ہے، نیز ائمہ کرام کے فقہی اختلافات کو بھی اس میں مختصراً ذکر کر دیا ہے، نیز جن مسائل میں ائمہ کرام کا

(۱) کشف الظنون عن اسامی الکتب والفنون: ۲/۱۶۳۱۔

(۲) البحر الزاخر تجرید السراج الوہاج: ۱/ مخطوط: مکتبہ الحرم المکی السعودی۔

(۳) دیکھئے: حاشیہ الفہرس الشامل: ۲/۳۰۷، الفقہ واصولہ۔

(۴) دیکھئے: فہرس الأزہر الشریف: ۵/۳۷۳۔

اختلاف ہے وہاں ائمہ کے ناموں کو ذکر کرنے کے بجائے رموز کا استعمال کیا ہے؛ چنانچہ وہ رموز اس طرح ہیں :

- ''ح'' : امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے لئے۔
- ''س'' : امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے لئے۔
- ''م'' : امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے لئے۔
- ''ز'' : امام زفر رحمۃ اللہ علیہ کے لئے۔
- ''ف'' : امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے لئے۔
- ''ک'' : امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے لئے۔
- ''واؤ'' : ہمارے اصحاب کی روایت کے لئے۔

نیز آپؒ نے اس کتاب کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ اگر مجھے توفیق ملی تو میں خود اس کتاب کی شرح لکھوں گا اور اس کا نام ''الکافی'' رکھوں گا(۱)؛ چنانچہ اللہ رب العزت نے آپ کو یہ موقع عطا کیا اور آپ نے اس کتاب کی بہت ہی جامع اور ضخیم شرح لکھی، اسی طرح آپ نے الوافی کی کنز الدقائق کے نام سے تلخیص بھی کی ہے، جو فقہ حنفی میں بہت مشہور متن ہے، اور علماء احناف نے اس کی بکثرت شروحات لکھی ہیں، اس کتاب کے مخطوطے درج ذیل مکتبات میں ہیں :

1- مکتبہ قیصری راشد آفندی، ترکی، مخطوطہ نمبر:425۔
2- مکتبہ جامعۃ الریاض، مخطوطہ نمبر:570۔
3- مکتبہ احمد ثالث، ترکی، مخطوطہ نمبر:937۔
4- مکتبہ جار اللہ آفندی، ترکی، مخطوطہ نمبر:902۔
5- مکتبہ لالہ لی، ترکی، مخطوطہ نمبر:1237۔

☆ الکافی شرح الوافی

یہ کتاب بھی علامہ نسفیؒ کی ہے، اور یہ وافی کی شرح ہے جو بہت ہی جامع اور مفید شرح ہے، مصنفؒ نے اس کتاب میں وافی کے مسائل کو بہت ہی واضح، مدلل اور تفصیلی طور پر بیان کیا گیا ہے اور نیز مصنفؒ نے صراحت کی ہے :

---

(۱) الکافی شرح الوافی: ۱، مخطوط: مکتبہ کوبر یلی، ترکی، دیکھئے: دیگر مکتبات کے مخطوطات۔

یہ کتاب مطولات سے بے نیاز کرنے والی، وجوہ استدلال کو احاطہ کرنے والی
اور علامہ مرغینانی کی ہدایہ کے مبہم نکات ومسائل کو واضح کرنے والی ہے۔(۱)

فتاویٰ ہندیہ میں جہاں کہیں کافی کا ذکر آیا ہے، اس سے یہی کافی مراد ہے، اس کتاب پر تحقیق کی ضرورت ہے، اس کا مخطوطہ ان مکتبات میں موجود ہے :

1- مکتبہ قیصری راشد آفندی، ترکی، مخطوطہ نمبر:455۔
2- مکتبہ وبر یلی، ترکی، مخطوطہ نمبر: 612۔
3- مکتبہ اسعد آفندی، ترکی، مخطوطہ نمبر:887۔
4- مکتبہ شہید علی پاشا، ترکی، مخطوطہ نمبر:867-868۔
5- مکتبہ فیض اللہ آفندی، ترکی، مخطوطہ نمبر:849-850۔

☆ المصفیٰ

یہ کتاب منظومۃ النسفی فی الخلاف کی شرح ہے، منظومۃ النسفی کے مصنف ابوحفص عمر بن محمد بن احمد النسفی (متوفی:537ھ) ہیں، مصنفؒ نے اس کتاب کو دس ابواب پر مرتب کیا ہے، جو اس طرح ہیں :

- الباب الاول: فی قول الامام۔
- الباب الثانی: فی قول ابی یوسف۔
- الباب الثالث: فی قول محمد۔
- الباب الرابع: فی قول الامام، مع ابی یوسف۔
- الباب الخامس: فی قولہ مع محمد۔
- الباب السادس: فی قول ابو یوسف مع محمد۔
- الباب السابع: فی قول کل واحد منہم۔
- الباب الثامن: فی قول زفر۔
- الباب التاسع: فی قول الشافعی۔
- الباب العاشر: فی قول مالک۔

اس کتاب کی تکمیل بروز ہفتہ، ماہ صفر 504ھ کو ہوئی، اس کتاب میں اشعار کی تعداد:2669 (دو ہزار چھ سو انہتر) ہے، اس کتاب کی شرح متعدد علماء کرام نے کی ہیں، جن میں سر فہرست ابوالبرکات حافظ الدین عبداللہ بن احمد النسفی (متوفی:710ھ) ہیں۔

علامہ ابوالبرکات نسفیؒ نے اس کتاب کی شرح ''المصفیٰ'' کے نام سے لکھی ہے، جیسا کہ آپ اس کتاب کے آخر میں رقمطراز ہیں :

(۱) الکافی شرح الوافی:۱، مخطوط: مکتبہ کوبریلی، ترکی، نیز دیکھئے: دیگر مکتبات کے مخطوطات۔

> جب میں النافع کی شرح اور اس کا املاء کرانے سے فارغ ہوا (اور اس کا نام المستصفیٰ من المستوفی ہے) تو مجھ سے بعض دینی بھائیوں نے درخواست کی کہ میں منظومۃ الخلاف کی ایک ایسی شرح لکھوں جو دقائق وحقائق پر مشتمل ہو؛ لہٰذا میں نے ان کی درخواست کو قبول کیا اور المصفیٰ کے نام سے اس کی شرح لکھی، اور الحمدللہ اس شرح کی تکمیل 20/شعبان بروز منگل 670ھ کو ہوئی۔

مزید آگے لکھتے ہیں:

> اس کتاب میں جو بھی مسائل ہیں وہ شرح المبسوط، الاسرار، المختلفات، الایضاح، الہدایہ اور ہدایہ کی شروحات ودیگر کتابوں سے منقول ہیں، جن میں سے بعض کتابوں کے حوالے میں نے لکھ دیے ہیں اور بعض کتابوں کے حوالے نہیں لکھے ہیں۔(۱)

فتاویٰ عالمگیری میں اس کتاب سے سات مسائل لئے گئے ہیں، جن میں سے پانچ جگہ ''کذا فی المصفیٰ'' اور دو جگہ ''کذا فی شرح المنظومہ'' ہے، یہ کتاب 2019ء میں مکتبہ النور المبین سے حسن اوزور کی تحقیق کے ساتھ شائع ہوئی ہے، اس کے بعض قلمی نسخے درج ذیل مکتبات میں ہیں:

6- مکتبہ ولی الدین آفندی، ترکی، مخطوطہ نمبر: 1255-1256۔
7- مکتبہ وبر یلی، ترکی، مخطوطہ نمبر: 597۔
8- مکتبہ جاراللہ آفندی، ترکی، مخطوطہ نمبر: 746۔
9- مکتبہ شہید علی، ترکی، مخطوطہ نمبر: 973۔
10- مکتبہ نور عثمانیہ، ترکی، مخطوطہ نمبر: 1653۔(۲)

☆ التجرید

تجرید کے نام سے فقہ حنفی میں کئی کتابیں ہیں؛ البتہ ان میں دو کتابیں زیادہ معروف ہیں: ایک امام ابوالحسین احمد بن محمد قدوری (متوفی: ۴۲۸ھ) کی کتاب ''تجرید القدوری''، دوسری: علامہ رکن الدین عبدالرحمٰن بن محمد المعروف بہ ابن امیرویہ کرمانی حنفی (متوفی: ۵۴۳ھ) کی التجرید، اس کتاب کا پورا نام التجرید الرکنی فی الفروع ہے، فتاویٰ ہندیہ میں تجرید سے یہی کتاب مراد ہے۔

(۱) المصفیٰ: ۲۶۷، مخطوط: مکتبہ ولی الدین جاراللہ آفندی، ترکی، نیز دیکھئے: کتائب اعلام الاخیار: ۲/ ۲۲۴۔
(۲) دیکھئے: الفہرس الشامل: ۹/ ۶۸۵، الفقہ واصولہ، معجم تاریخ التراث الاسلامی: ۲/ ۱۳۶۳۔

علامہ قدوری کی تجرید فقہ مقارن پہ ایک انسائیکلو پیڈیا ہے اور بارہ جلدوں میں تحقیق ودراسہ کے ساتھ شائع ہوچکی ہے۔

اکثر سوانح نگاروں نے ذکر کیا ہے کہ تجرید کی ایک شرح خود مصنفؒ نے ''الایضاح'' کے نام سے تین جلدوں میں لکھی ہے، اور دوسری شرح شمس الائمہ تاج الدین عبدالغفار بن لقمان کردری حنفی (متوفی: ۵۲۲ھ) نے ''المفید والمزید'' کے نام سے سپردِ قلم کی ہے(۱)، مصادر دراسات اسلامیہ کے مصنف دکتور یوسف عبدالرحمٰن مرعشی لکھتے ہیں کہ ہمیں اس کتاب کے چار مخطوطے ملے، اس کا سب سے قدیم نسخہ مکتبہ صامصون ترکی (رقم: 708) میں ہے(۲)؛ لیکن ایضاح کے مقدمہ میں مصنفؒ لکھتے ہیں کہ شیخ ابوالحسن کرخی نے فقہ میں ایک کتاب تصنیف کی اور اس کو ابواب پر مرتب کیا، پھر شیخ ابوالحسن قدوری نے اس میں مسائل اور دلائل کا اضافہ کیا؛ چنانچہ جب میں نے علامہ قدوری کی مختصر کرخی کی شرح کا مطالعہ کیا تو اسے بہت ہی عمدہ، نفیس اور ابواب کے مسائل کو ہم آہنگ پایا، لہٰذا میری خواہش ہوئی کہ میں اس کی شرح اپنے اسلاف کے نہج پہ مفصل طریقہ پر کروں، اس کے مفاہیم کی تشریح کروں اور ان مفاہیم کی مؤثر علل کا ذکر کروں؛ چنانچہ میں نے اس کی شرح ''ایضاح'' کے نام سے لکھی، پھر میرے بعض احباب نے مجھ سے خواہش کی کہ میں اس کتاب کے اہم مسائل اور معتمد علیہ روایات کو الگ کردوں؛ تاکہ اس کو پڑھنا اور یاد کرنا آسان ہو، تو میں نے ان لوگوں کی درخواست کو قبول کیا۔(۳)

مصنفؒ کی مذکورہ بالا تصریح سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ تجرید ایضاح کی تلخیص ہے اور ایضاح مختصر کرخیؒ اور علامہ قدوریؒ کے حاشیہ کی شرح ہے۔

دوسری بات یہ کہ مصنف نے ایضاح کے مقدمہ میں کہیں بھی یہ بات ذکر نہیں کی کہ یہ تجرید کی شرح ہے؛ بلکہ ہر جگہ ایضاح شرح مختصر الکرخی لکھا ہے۔

تیسری بات یہ کہ تجرید کے لغوی معنی دیکھا جائے اس سے یہی پتہ چلتا ہے کہ یہ تلخیص ہے، جس کی تائید مصنفؒ کے اس قول سے ہوتی ہے کہ بعض احباب نے مجھ سے خواہش کی کہ میں ایضاح کے اہم مسائل اور معتمد علیہ روایات کو الگ کردوں؛ لہٰذا میں نے ان لوگوں کی درخواست کو قبول کیا۔

---

(۱) دیکھئے: ہدیۃ العارفین: ۱/ ۵۱۹، کشف الظنون: ۱/ ۳۴۵، تاج التراجم: ۱/ ۱۸۴، الجواہر المضیۃ: ۱/ ۳۰۴۔

(۲) دیکھئے: مصادر دراسات اسلامیہ: ۵/ ۲۶۸۔

(۳) الایضاح: ۱، مخطوط: مکتبہ ازمیر، ترکی، نیز دیکھئے: دیگر مکتبات کے مخطوطات۔

☆ الایضاح

اس نام سے اہل علم نے کئی کتابیں تصنیف کی ہیں، اور فتاویٰ ہندیہ میں اس نام سے دو کتابوں کے حوالے ملتے ہیں، ایک علامہ کرمانی کی ایضاح، اور دوسرے شیخ یحییٰ القوجھصاریؒ کی ایضاح، جو کنزالدقائق کی شرح ہے، عام طور سے جو دنیا کے مکتبات میں التجرید یا تجرید الایضاح یا الایضاح للرکنی کے نام سے مخطوطات پائے جاتے ہیں، اس سے یہی کتاب مراد ہے، دکتور یوسف عبدالرحمٰن مرعشی لکھتے ہیں کہ ہمیں اس کتاب کے آٹھ مخطوطے ملے، اوراس کا سب سے قدیم نسخہ مکتبہ ولی الدین استنبول ترکی (رقم:1230) میں ہے (۱)، نیز اس کے علاوہ درج ذیل مکتبات میں اس کتاب کے قلمی نسخے ہیں :

1- مکتبہ ازمیر، ترکی، مخطوطہ نمبر:160۔
2- مکتبہ وبریلی، ترکی، مخطوطہ نمبر:540۔
3- مکتبہ جاراللہ آفندی، ترکی، مخطوطہ نمبر:586اور597۔
4- مکتبہ ینی جامع، ترکی، مخطوطہ نمبر:369۔
5- مکتبہ عاطف آفندی، ترکی، مخطوطہ نمبر:911۔
6- مکتبہ اسعد آفندی، ترکی، مخطوطہ نمبر:964۔
7- مکتبہ الفاتح، ترکی، مخطوطہ نمبر:1780اور2272۔

☆ المفید والمزید

یہ کتاب التجرید الرکنی کی شرح ہے، اس کے مصنف ابوالمفاخر تاج الدین عبدالغفور بن لقمان کردی حنفی (متوفی:۵۲۲ھ) ہیں، بعض سوانح نگاروں نے آپ کا نام عبدالغفار ذکر کیا ہے، آپ علامہ رکن الدین عبدالرحمٰن کرمانی کے شاگرد تھے اور سلطان نورالدین کے زمانہ میں حلب کے قاضی رہے، آپ نے کئی کتابیں تصنیف کیں (۲)، جن میں سے ایک المفید والمزید ہے، فتاویٰ ہندیہ میں اس کتاب سے بالواسطہ پانچ مقامات پہ حوالہ آئے ہیں، اس کتاب کے قلمی نسخے ان کتب خانوں میں موجود ہیں :

(۱) دیکھئے: مصادر دراسات اسلامیہ: ۵/ ۲۶۸۔

(۱) دیکھئے: الجواہر المضیۃ: ۱/ ۳۲۳، ہدیۃ العارفین: ۱/ ۵۸۷، کشف الظنون: ۱/ ۳۴۵۔

1- مکتبہ قرہ حصار، ترکی، مخطوطہ نمبر: 181-182۔

2- مکتبہ مراد ملا، ترکی، مخطوطہ نمبر: 1084۔

☆ جواہر الاخلاطی

فقہ حنفی میں یہ ایک ایسی کتاب ہے جس کے اندر صرف ان مسائل کو جمع کیا گیا ہے، جن پر فتویٰ ہے یا فتویٰ دینا مناسب ہے؛ چوں کہ بسا اوقات فقہاء احناف کی کتابوں میں ایک ایک مسئلہ کے بارے میں کئی اقوال ملتے ہیں اوران اقوال میں تطبیق دینا مشکل ہوتا ہے؛ لہٰذا مصنف کتاب نے مجتہدین کی کتابوں کو کھنگال کر ایسے مسائل کو جمع کرنے کا التزام کیا ہے جن میں ایسے الفاظ وتعبیرات کا استعمال ہے جو فقہاء کرام کے درمیان متداول ہیں اور جن سے مسائل میں تطبیق دینا اور کسی ایک قول کا انتخاب کر کے فتویٰ دینا مناسب ہوتا ہے؛ چنانچہ وہ الفاظ وتعبیرات درج ذیل ہیں :

- ھوالصحیح
- وعلیہ الفتوی
- ھوالمختار
- ھوالمأخوذ بہ
- وبہ نأخذ
- ھوالمفتی
- ھوالأصح
- افتی بہ
- ھوالاحوط
- وبہ یفتی
- وھوالصحیح، وعلیہ الفتویٰ
- وعلیہ اجماع المتقد مین والمتأخرین
- وھواوسع وارفق
- وھوالاختیار
- والاول افضل
- وھوالاشبہ وبہ یفتی
- وعلیہ الاعتماد
- والاظہر الجواز
- وھوالصواب
- وھوالاظہر
- وھومأخوذ
- وھواقرب الی الصواب
- وھوالمشہور
- وھواحسن
- علیہ بالاتفاق
- ھوالمختار للفتوی
- الافتاء بالجواز
- ھذاالقیس
- وھوالاشبہ والاصوب
- ھذاالقول اشبہ بالصواب
- وبہ افتوا

اس کتاب کے مصنف کا نام برہان الدین ابراہیم بن ابوبکر محمد بن حسین الاخلاطی الحسینی ہے، المفہرس الشامل میں ہے کہ آپ گیارھویں صدی ہجری کے علماء میں سے تھے(۱)، اس کتاب کو بہت ہی مستند ومعتبر ماخذ میں شمار کیا گیا ہے، (۲) فتاویٰ عالم گیری میں بکثرت اس کے حوالے موجود ہیں، نیز ملا علی قاریؒ نے اپنے رسالہ

---

(۱) دیکھئے: الفہرس الشامل: ۳/ ۲۲، الفقہ واصولہ۔ (۲) معجم المصنفین: ۴/ ۵۱۴۔

''التدھین للتزیین علی وجہ التبیین''اور علامہ ابن عابدین شامیؒ نے بھی اپنی کتابوں میں اس کتاب سے استفادہ کیا ہے۔

مصنف علیہ الرحمہ کتاب کے مقدمہ میں لکھتے ہیں :

میں نے علم فقہ کو تمام علوم میں سب سے زیادہ ارفع وعظیم الشان اور اس لائق پایا کہ اس پر توجہ دی جائے اور اس پر بھروسہ کیا جائے؛ چنانچہ میری خواہش ہوئی کہ میں فقہ کے بعض ان مسائل کا انتخاب کروں جن میں عوم بلوی ہے، اور اس میں حتمی فیصلہ کی ضرورت ہے؛ تاکہ اس فن کے لوگوں کے لئے فتویٰ دینا آسان ہو، نیز میں نے اس کتاب میں ائمہ فقہ کے لئے ایسے ناموں کا استعمال کیا ہے جن سے وہ معروف ومشہور ہیں؛ لہٰذا وہ نام اس طرح ہیں :

- الامام : نعمان بن ثابت کے لئے۔
- القاضی : ابو یوسفؒ کے لئے۔
- الشیبانی : محمد بن الحسن کے لئے۔
- ابن الھذیل : امام زفر کے لئے۔
- محمد بن ادریس : امام شافعی کے لئے۔
- ابن زیاد : حسن بن زیاد کے لئے۔(۱)

اس کتاب کا مخطوطہ بہت کم کتب خانوں میں دستیاب ہیں :

1- مکتبہ جون ریلاندز/مانچسٹر(206/351)۔
2- مکتبہ معہد الاستشراق/بطرسبورغ(C1407)۔
3- رضا لائبریری، رامپور، (M5151/2577)-(M5150/2578)۔
4- معہد الابحاث العربیہ والفارسیہ ٹونک، راجستھان، (619/T953)۔(۲)
5- مکتبہ ملک عبد العزیز ریاض، سعودی، مخطوطہ نمبر: 2554۔

---

(۱) جواہر الاخلاطی: ا، مخطوط: مکتبہ ملک عبد العزیز ریاض، سعودی۔

(۲) دیکھئے: الفہرس الشامل: ۳/ ۲۲۲، الفقہ واصولہ۔

☆ خزانۃ الفتاوی

یہ کتاب احمد بن محمد بن ایوب کرمانی (متوفی: 522ھ) کی تالیف ہے، مصنفؒ نے اپنی ہی کتاب مجمع الفتاویٰ کی تلخیص ''خزانۃ الفتاویٰ'' نام سے کی ہے، جیسا کہ اس کتاب کے مقدمہ میں مؤلفؒ لکھتے ہیں :

> جب میں مجمع الفتاویٰ کو لکھنے سے فارغ ہوا (جس میں علماء عظام ومشائخ کرام جیسے الصدر الشہید، ابوبکر محمد بن فضل البخاری، شیخ محمد بن ولید السمرقندی، ابوالحسن رستفغنی، علامہ عتابی وغیرہ کے کتب فتاویٰ سے مسائل کو اس میں جمع کیا ہے) تو بعض بھائیوں نے مجھ سے خواہش کی کہ میں مجمع الفتاویٰ سے نادر مسائل کو ایک کتابی شکل میں جمع کردوں جو طوالت اور دلائل سے خالی ہو۔(۱)

یہ ایک معتبر کتاب ہے، اس کتاب سے علامہ حصکفیؒ، علامہ ابن نجیم مصریؒ، علامہ ابن عابدین شامیؒ، صاحب النہر الفائق، علامہ حمویؒ، ملا خسروؒ، علامہ حلبیؒ صاحب لسان الحکام وغیرہ نے اپنی تصنیفات میں استفادہ کیا ہے، اور فتاویٰ عالمگیری میں ساٹھ سے زائد مقامات پر اس کتاب کے حوالے ہیں، اس کتاب کے مخطوطے کئی کتب خانوں میں ہے، جن میں سے بعض یہ ہیں :

1- مکتبہ نور عثمانیہ، ترکی، مخطوطہ نمبر: 1943۔
2- مکتبہ جار اللہ آفندی، ترکی، مخطوطہ نمبر: 925۔
3- جامعہ پرنسٹون، امریکہ، مخطوطہ نمبر: 2084۔
4- مکتبہ فیض اللہ آفندی، ترکی، مخطوطہ نمبر: 1017-1018۔
5- مکتبہ داماد ابراہیم پاشا، ترکی، مخطوطہ نمبر: 690۔

(جاری)

● ● ●

---

(۱) خزانۃ الفتاویٰ: ا، مخطوط: مکتبہ نور عثمانیہ، ترکی۔

محدثین کرام اور فقہاء عظام — ایک جائزہ

مولانا عبید اختر رحمانی
(شعبۂ تحقیق: المعهد العالی الاسلامی حیدرآباد)

فقہ کی عظمت اور فقہاء کرام کی رفعت شان مسلم ہے، تاریخ اسلام کے ہر دور میں فقہاء کرام کی عظیم الشان خدمات کے لئے ان کو خراج تحسین پیش کیا گیا ہے، یہی وہ لوگ ہیں جنھوں نے تن سوزی اور جاں سوزی کر کے اُمتِ مسلمہ کی شرعی مسائل میں رہنمائی کی، دور حاضر میں کچھ لوگوں نے یہ ظلم کیا ہے کہ محدثین کرام کی حمایت کے نام پر وہ فقہاء کرام کو مطعون کرنے لگے ہیں، حدیث کے نام پر فقہ کی مخالفت اور محدثین کی حمایت کے نام پر فقہاء کو مطعون کرنا اہل فکر و دانش کی نگاہ میں حب علی نہیں بغض معاویہ کے قبیل سے ہے، ایسے لوگ حقیقی معنوں میں حدیث اور محدثین کے بھی خیر خواہ اور ہمدرد نہیں ہیں۔

شیخ البانی علم حدیث میں خصوصی مقام کے حامل ہیں، اگر چہ ان کی احادیث کی تصحیح اور تضعیف پر بہت کچھ کلام کیا جاسکتا ہے اور اس میں بہت کچھ تضاد موجود ہے، اس پر صرف غیروں نے ہی نہیں؛ بلکہ ان کے اپنوں نے بھی نکتہ چینی کی ہے؛ لیکن ہمارا موضوع فی الحال یہ نہیں ہے؛ بلکہ ان کا ارشاد ہے، جس کا مفہوم ہے کہ ''فقہاء پر ضروری ہے کہ وہ محدث بنیں محدثین پر فقہاء بننا ضروری نہیں'' ہے اور پورے مضمون کا خلاصہ یہ ہے کہ حدیث دانی کے ضمن میں فقاہت آٹو میٹک اور خودساختہ طور پر حاصل ہوجاتی ہے، محدث البانی کا اپنا کلام ہے :

> يلزم الفقيه أن يكون محدثاً ، ولا يلزم المحدث أن يكون فقيهاً ؛ لأن المحدث فقيه بطبيعة الحال ۔
>
> فقیہ کے لئے ضروری ہے کہ وہ محدث ہو اور محدث کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ فقیہ ہو؛ کیوں کہ محدث طبعی طور پر فقیہ ہوتا ہی ہے۔

البانی صاحب کا یہ ارشاد اپنے آپ میں بہت انوکھا اور نرالا ہے اور علماء سلف وخلف کے متفقہ تمام

ارشادات واقوال کے خلاف ہے جس میں فقہ کی ضرورت اور اہمیت کو واضح کیا گیا ہے اور اگر اہل حدیث حضرات کے خاطر اقدس پر ملال نہ آئے تو یہ بھی عرض کردوں کہ یہ حدیث رسول ﷺ اور ارشاد پیغمبر کے بھی خلاف ہے۔

فقیہ اور محدث کے درمیان فرق کیا ہے، محدث ایک حدیث کی روایت کرتا ہے، بسا اوقات اس کی نظر صرف اس کے ظاہری پہلو کی جانب جاتی ہے، جب کہ فقیہ اس کے دوسرے پوشیدہ پہلوؤں پر بھی نگاہ رکھتا ہے اور اس سے مسائل کا استنباط کرتا ہے، بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک فقیہ ایک حدیث سے سینکڑوں مسائل کا استنباط کرتا ہے، جب کہ محدث کی نگاہ صرف اس کے ظاہری پہلوؤں پر ہوتی ہے۔

اگر اس کو اقبال کے الفاظ میں کہیں تو :

دو صد دانا دریں محفل سخن گفت　　سخن نازک تر از برگ سمن گفت
ولے بامن بگو آں دیدہ ورکیست　　کہ خارے دید و احوال چمن گفت

دوسو عقلمندوں نے محفل میں اپنے خیالات ظاہر کئے، ان کی باتوں میں پھول کی پتیوں سے زیادہ نزاکت تھی؛ لیکن مجھے یہ تو بتاؤ کہ اس میں کوئی ایسا بھی تھا جس کی دور بینی پیش بینی اور پیش گوئی اس درجے کی ہو کہ کانٹوں کو دیکھ کر چمن کے احوال بیان کردے۔

ہم بھی یہی کہنا چاہتے ہیں کہ فقیہ وہی ہوتا ہے جو حدیث کے ظاہری معنی کو ہی نہیں؛ بلکہ باطنی اور پوشیدہ معانی کو اپنے قوت اجتہاد و استنباط سے باہر لاتا ہے، اس کے مخفی گوشوں کی نقاب کشائی کرتا ہے، اس کے پیچیدہ اور برہم گیسوؤں کو سلجھاتا ہے۔

ہم ترتیب وار اپنے دلائل بیان کرتے ہیں؛ تاکہ واضح ہوجائے کہ فقاہت کے لئے محض حدیث دانی کافی نہیں ہے اور کسی کا محدث ہونا اس کے فقیہ ہونے کے لئے لازم وملزوم کی حیثیت نہیں رکھتا ہے۔

(۱) قرآن پاک کا مقام ومرتبہ حدیث سے زیادہ ہے، اس کے الفاظ محفوظ ہیں، اس کے عجائبات کبھی ختم ہونے والے نہیں، اس کے فقروں اور جملوں میں معانی کی ایک دنیا آباد ہے، اس کے باوجود کسی نے یہ نہیں کہا کہ قرآن کا حافظ ہونے سے انسان فقیہ ہوجاتا ہے، یا اس کے اشارات، مقاصد، مراد اور دیگر اشیاء سے واقف ہوجاتا ہے اور قرآن میں جو فقہیات مذکور ہیں، وہ ان سے آشنا ہوجاتا ہے، پھر حدیث کے بارے میں یہ دعویٰ کیسے کیا جاسکتا ہے کہ اس کی واقفیت سے فقاہت خود بخود آجائے گی۔

(۲) احادیث پاک میں بھی کئی ایسی حدیثیں ہیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ محدث کا وظیفہ الگ ہے اور فقیہ کا وظیفہ الگ ہے، حضور پاک ﷺ نے اپنے ارشادات میں فقیہ اور محدث کی الگ الگ تعریف کی ہے، اگر محدثین کی فضیلت میں نضر اللہ امراسمع مقالی الخ فرمایا تو فقہاء کی تعریف میں ارشاد فرمایا: ''**من یرد اللہ به خیرا یفقهه فی الدین**''۔(۱)

یہ تقسیم ہی بتا رہی ہے کہ دونوں کا وظیفہ ایک دوسرے سے الگ ہے، ورنہ الگ الگ دونوں کی تعریف کی ذکر کی ضرورت نہ ہوتی؛ کیوں کہ جب حدیث دانی کے ضمن میں فقاہت حاصل ہو رہی ہے تو اصل تعریف حصول حدیث کی ہونی چاہئے، نہ کہ فقاہت کی؛ لیکن ارشاد رسول اس کے برخلاف ہے کہ فقہ کی اُصولی طور پر تعریف کی جارہی ہے، اس استدلال پر جتنا غور کریں گے اتنا ہی آپ پر واضح ہوتا جائے گا کہ فقیہ کا وظیفہ محدث کے وظیفہ سے الگ ہے، دونوں کا منصب الگ ہے۔

ہم کچھ احادیث پیش کریں گے جس سے یہ حقیقت مزید نمایاں ہوجائے گی کہ حدیث دانی، احادیث کا علم اور اس سے واقفیت فقاہت کے لئے لازمی نہیں ہے، اس کے بعد ہم کچھ بزرگوں کے اقوال اور واقعات بھی پیش کریں گے جس سے ہر ایک پر عیاں ہوجائے گا کہ محدث اور فقیہ میں تطابق اور تلازم کا دعویٰ کا درست نہیں ہے۔

(۳) اس باب میں سب سے زیادہ معتبر اور قول فیصل رسول پاک ﷺ کا ارشاد ہے جس میں آپ ﷺ نے انتہائی صراحت اور وضاحت سے بتا دیا ہے کہ صرف حدیث دانی فقاہت کے لئے کافی نہیں ہے :

نضر الله امرءاً سمع منا حديثاً فأداه كما سمعه فرب مبلغ أوعى من سامع ، ورب حامل فقه إلى من هو أفقه منه ۔ (۲)

اللہ اس شخص کو تر وتازہ رکھے جس نے حدیث کو سنا پھر اس کو ویسے ہی ادا کیا جیسا کہ اس نے سنا، بہت سے ایسے افراد جن کو پہنچایا جاتا ہے وہ سننے والے سے زیادہ محفوظ کرنے والے اور فقیہ ہوتے ہیں، ایک دوسری حدیث میں نبی پاک ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ''**ورب حامل فقه ليس بفقيه**'' (اور بہت سے حاملین فقہ فقیہ نہیں ہیں)۔

---

(۱) صحیح بخاری۔

(۲) جامع ترمذی، حدیث نمبر: 2656، اس کے علاوہ یہ حدیث امام ابوداؤد نے سنن ابی داؤد میں، حدیث نمبر: 3660، ابن عبدالبر نے التمہید: 21/276 میں نقل کیا ہے۔

آخری جملہ نبی پاک ﷺ کا اپنے مدعا اور مدلول پر کس درجہ صریح اور واضح ہے: ''رب حامل فقه لیس بفقیه ''فقہ کے سرچشمہ اور مصدر میں سے دوسرے نمبر یعنی حدیث کے واقف کار، جانکار اور حافظ ہیں؛ لہٰذا حامل فقہ ہیں؛ لیکن بذات خود ان احادیث سے مسائل کے استنباط کی صلاحیت اور سلیقہ نہیں ہے؛ لہٰذا وہ فقیہ نہیں ہیں۔

اس صریح اور واضح ارشاد نبوی کے بعد یہ دعویٰ کرنا کہ ہر فقیہ محدث ہوتا ہے یا جو حدیث کا جتنا بڑا جانکار وہ اتنا بڑا فقیہ کیا حدیث نبوی کی مخالفت نہیں ہے؟ تعجب ہے جو لوگ چند محدثین کرام کے نقول اور بیانات کی بنیاد پر امام ابوحنیفہؒ پر مخالفت حدیث کا راگ الاپتے ہیں، وہ خود محدثین کرام کی حمایت میں اس حد تک بڑھ جاتے ہیں جہاں صریح حدیث کا مدلول اور مقتضاء بھی ان کی نگاہوں سے اوجھل ہوجاتا ہے؛ اگرچہ یہ حدیث فی نفسہ حدیث دانی کو فقاہت کا پیمانہ بنانے کے دعویٰ کو غلط ثابت کرنے کے لئے کافی ہے، اس کے باوجود ہم رسول پاک ﷺ کا ایک اور ارشاد پیش کرتے ہیں :

> إن مثل ما بعثني الله عز وجل به من الهدى والعلم كمثل غيث أصاب الأرض فكانت منه طائفة قبلت فأنبتت الكلأ والعسب الكثير وكانت منها أجادب أمسكت الماء فنفع الله عز وجل بها ناسا فشربوا فرعوا وسقوا وزرعوا واسقوا وأصابت طائفة منها أخرى إنما هي قيعان لا تمسك ماء ولا تنبت كلأ فذلك مثل من فقه في دين الله عز و جل ونفعه الله عز وجل بما بعثني به ونفع به فعلم وعلم ومثل من لم يرفع بذلك رأسا ولم يقبل هدى الله عز و جل الذي أرسلت به . (۱)

> اللہ تعالیٰ نے مجھے جو ہدایت اور علم دے کر مبعوث کیا ہے اس کی مثال ایسی ہے جیسے زور کی بارش ہوئی، زمین کے ایک بہترین اور قابل زراعت ٹکڑے نے پانی جذب کیا اور اسی کے ساتھ ساگ پات اور گھاس اور چارہ کثرت سے اُگایا اور زمین کا ایک حصہ وہ ہے جو سخت ہے، اس سے کوئی چیز اُگتی تو نہیں؛ لیکن اس

(۱) بخاری:1/18، مسلم:2/247، مشکوٰۃ:1/28۔

حصہ میں پانی خوب جمع ہوگیااوراس جمع شدہ پانی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے لوگوں کونفع بخشا کہ وہ خود بھی پیتے ہیں اور جانوروں کو بھی پلاتے ہیں اور کھیتی کوسیراب کرتے ہیں اور زمین کا ایک اور قطعہ وہ ہے جو بالکل چٹیل ہے، نہ تو وہ پانی کو روک سکتا ہےاور نہ گھاس وسبزہ وغیرہ اُگانے کی صلاحیت اس میں موجود ہے۔

پھر آپ ﷺ نے اس کی تمثیل بھی بیان کی :

یہ مثال ہے اس شخص کی جس نے اللہ تعالیٰ کے دین میں فقاہت حاصل کی اوراللہ تعالیٰ نے اس چیز سے نفع عطا کیا، جو چیز اللہ نے مجھے دے کر مبعوث کیاہے جس کو اس نے سیکھااور سکھایا اور مثال ہے اس کی جس نے ہدایت خداوندی کی طرف جس کو میں لے کر آیا ہوں مطلقاً سر ہی نہ اُٹھایا۔

حدیث میں درمیان کے ان افراد کی تمثیل چھوٹ گئی ہے جس نے پانی کو روکا؛ لیکن اس کو نفع بخش نہیں بنایا، یاتو راوی سے سہوا ہو یا پھر آنحضرت ﷺ نے ہی بیان نہ کیا ہو کہ اس کی تمثیل لوگ خود سمجھ جائیں گے۔

اس حدیث کی تشریح تقریباً تمام علماء نے اسی سے کی ہے کہ پہلی قسم جس نے پانی کو بھی جذب کیااوراس سے پھل پھول غلے پودے اُگائے وہ فقہاء کرام ہیں، اور دوسری قسم جس نے صرف پانی کو روکا اور جذب کیا اوراس کے ذریعہ دوسروں نے فائدہ اُٹھایا وہ محدثین کرام ہیں، اور تیسرے قسم پانچویں سوار ہیں، اس حدیث کی شرح میں حافظ ابن قیم الوابل میں لکھتے ہیں :

قال ابن القيم في الوابل تعليقا على هذا الحديث : الطبقة الثانية : فإنها حفظت النصوص وكان همها حفظها وضبطها فوردها الناس وتلقوها منهم فاستنبطوا منها واستخرجوا كنوزها واتجروا فيها وبذروها في أرض قابلة للزرع والنبات ووردها كل بحسبه ''قد علم كل أناس مشربهم'' وهؤلاء هم الذين قال فيهم النبي صلى الله عليه و سلم ''نضر الله امرءا سمع مقالتي فوعاها ثم أداها كما سمعها فرب حامل فقه غير فقيه ورب حامل فقه إلى من هو أفقه منه''۔

وهذا عبد الله بن عباس حبر الأمة وترجمان القرآن مقدار ما سمع من النبي صلى الله عليه و سلم لم يبلغ نحو العشرين حديثا الذي يقول فيه سمعت ورأيت وسمع الكثير من الصحابة وبورك في فهمه والاستباط منه حتى ملأ الدنيا علما وفقها قال أبو محمد بن حزم : وجمعت فتاويه في سبعة أسفار كبار وهي بحسب ما بلغ جامعها وإلا فعلم أبن عباس كالبحر وفقه واستنباطه وفهمه في القرآن بالموضع الذي فاق به الناس وقد سمع كما سمعوا وحفظ القرآن كما حفظوا ولكن أرضه كانت من أطيب الأراضي وأقبلها للزرع فبذر فيها النصوص فأنبتت من كل زوج كريم ''ذلك فضل الله يؤتيه من يشاء والله ذو الفضل العظيم''۔

وأين تقع فتاوى أبن عباس وتفسيره واستنباطه من فتاوى أبي هريرة وتفسيره ؟ وأبو هريرة أحفظ منه بل هو حافظ الأمة على الإطلاق يؤدي الحديث كما سمعه ويدرسه بالليل درسا فكانت همته مصروفة إلى الحفظ وبلغ ما حفظه كما سمعه وهمة ابن عباس مصروفة إلى التفقه والاستنباط وتفجير النصوص وشق الأنهار منها واستخراج كنوزها ، وهكذا الناس بعده قسمان : (قسم حفاظ) معتنون بالضبط والحفظ والأداء كما سمعوا ولا يستنبطون ولا يستخرجون كنوز ما حفظوه وقسم معتنون بالاستنباط واستخراج الأحكام من النصوص والتفقه فيها فالأول كأبي زرعة وأبي حاتم وابن دارة وقبلهم كبندار ومحمد بن بشار وعمرو الناقد وعبد الرزاق وقبلهم كمحمد بن جعفر غندر وسعيد

> بن أبي عروية وغيرهم من أهل الحفظ والاتقان والضبط لما سمعوه من غير استنباط وتصرف وأستخراج الأحكام من ألفاظ النصوص (والقسم الثاني) كمالك والشافعي والاوزاعي وإسحق والإمام أحمد بن حنبل والبخاري وأبي داود ومحمد بن نصر المروزي ، وأمثالهم ممن جمع الاستنباط والفقه إلى الرواية ، فهاتان الطائفتان هما أسعد الخلق بما بعث الله تعالى به رسوله صلى الله عليه و سلم وهم الذين قبلوه ورفعوا به رأسا.....

حافظ ابن قیمؒ کے ارشاد کا خلاصہ یہ ہے کہ اُمت میں دو طبقے ہیں ایک حفاظ حدیث کا جنھوں نے حدیث کے الفاظ کو یاد کرنے کا اہتمام کیا اس کی روایت کی اور اس کو محفوظ اور منتقل کرنے کی کوشش کی ''شکر الله سعيهم '' دوسرا طبقہ وہ ہے جس نے احادیث کا بھی اہتمام کیا اور اس کے بعد اس سے مسائل کا استنباط کیا اور لوگوں کے شرعی مسائل میں ان کی رہنمائی کی۔

حافظ ابن قیم نے دونوں طبقوں کی واضح طور پر تقسیم کی ہے، حافظ ابن قیم کا کہنا ہے کہ صحابہ کرام میں بھی یہ دو طبقے موجود تھے؛ چنانچہ حضرت عبداللہ بن عباس نے اگر چہ آنحضرت سے روایتیں کیں؛ لیکن ان کے اندر موجود قوت استنباط اور فقہی ملکہ نے ان کو صحابہ کے دور میں ہی فقیہ بنا دیا، اور حضرت ابو ہریرہؓ اگر چہ حفظ حدیث میں ان سے بہت آگے ہیں؛ لیکن ایک تو ان سے اتنے فتاویٰ اور شرعی مسائل کے جوابات منقول نہیں ان کی توجہ صرف حفظ حدیث، الفاظ کی صحیح ادائیگی اور اسے کما حقہ دوسروں تک منتقل کرنے کی جانب متوجہ تھی۔

اس کے بعد حافظ ابن قیمؒ نے غیر فقیہ حفاظ حدیث کے طور پر ابوزرعہ، ابو حاتم، ابن دارہ، محمد بن بشار، عمرو الناقد، عبدالرزاق، محمد بن جعفر بن غندر، سعید بن ابی عروبہ کا نام گنایا ہے، یہ تمام حضرات علم حدیث کے آفتاب و ماہتاب ہیں؛ لیکن ان کو فقاہت حاصل نہیں تھی۔

دوسرا طبقہ وہ ہے جو کہ احادیث سے مسائل کے استنباط واستخراج کا ملکہ رکھتا ہے؛ فرمانِ رسول میں مضمر معنی کو ڈھونڈنے کی صلاحیت اور لیاقت رکھتا ہے، وہ گوشے جو مخفی ہیں ان کو اپنی باریک بینی سے دیکھ سکتا ہے اور حدیث میں جو علت پنہاں ہے اس کی تخریج کرکے اس پر دوسرے مسائل منطبق کرسکتا ہے، اس گروہ میں

حافظ ابن قیمؒ نے امام مالکؒ، شافعیؒ، اوزاعیؒ، اسحٰقؒ، احمد بن حنبلؒ، بخاریؒ، محمد بن نصر المروزیؒ کے نام گنائے ہیں۔

ان دو احادیث اور اس کے واضح مفہوم کے بعد اس میں شک کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ صرف حدیث دانی سے کوئی انسان فقیہ نہیں بن جاتا، فقاہت کا پیمانہ حدیث کی واقفیت اور جانکاری نہیں ہے فقیہ بننے کے لئے اس کے علاوہ اور بہت سارے علوم کی ضرورت پڑتی ہے۔

اس کے علاوہ بزرگوں کے واقعات ارشادات بھی اس موقع پر ذکر کئے جانے کے قابل ہے، اس سلسلے میں اجلہ علماء، فقہاء محدثین کے تمام ارشادات تو نقل نہیں کئے جاسکتے، کچھ ارشادات بطور نمونہ نقل کئے جارہے ہیں جس سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں ہوگا کہ وہ بھی یہی سمجھتے تھے کہ فقہ کا میدان دوسرا ہے اور حدیث کا میدان دوسرا، محدثین کا وظیفہ الگ ہے اور فقہاء کا منصب الگ ہے۔

امام اعمش مشہور محدث ہیں، انھوں نے امام ابوحنیفہ سے مسائل پوچھے، امام ابوحنیفہ نے ان کا جواب دیا، امام اعمش نے پوچھا کہ یہ مسائل تم نے کہاں سے اخذ کئے۔ انھوں نے بتایا کہ ہم نے یہ مسائل آپ کی بیان کردہ فلاں فلاں روایتوں سے اخذ اور مستنبط کیا ہے، اس پر امام اعمش نے فرمایا اے گروہ فقہاء تم ڈاکٹر طبیب اور حکیم اور ہم پنساری اور کیمسٹ ہیں، امام اعمش کے الفاظ ہیں: ''یا معشر الفقهاء انتم الاطباء ونحن الصيادلة'' (اے گروہ فقہاء، تم طبیب ہو اور ہم (محدثین) پنساری ہیں)۔

اور پوری روایت ہے:

> اخبرنا حسن بن علی الجوهری، انا محمد بن عباس الخزاز، نا ابوبکر عبد الله بن محمد بن زیاد النیشاپوری، قال سمعت ابا ابراهیم المزنی، قال: انا علی بن معبد، نا عبید الله بن عمرو، قال: کنا عند الاعمش وهو یسال ابا حنیفة عن مسائل ویجیبه ابو حنیفة فیقول له الاعمش من این لک هذا، فیقول انت حدثتنا عن ابراهیم بکذا وحدثتنا بکذا وحدثتنا عن الشعبی بکذا، قال: فکان الاعمش عند ذلک یقول، یا معشر الفقهاء انتم الاطباء ونحن الصیادلة۔ (۱)

(۱) شرف اصحاب الحدیث ونصیحۃ اہل الحدیث: 261۔

عبید اللہ بن عمرو کہتے ہیں ہم امام اعمش ے پاس تھے اور وہ امام ابوحنیفہ سے کچھ مسائل کے تعلق سے دریافت کررہے تھے اور امام ابوحنیفہ ان ا جواب دے رہے تھے، امام اعمش نے پوچھا کہ آپ نے جو جواب دیا ہے اس کی آپ کے پاس یا دلیل ہے؟ اس پر امام ابوحنیفہ نے کہا کہ آپ نے ہم سے ابراہیم نخعی کے واسطہ سے فلاں فلاں روایتیں بیان ی تھیں اور آپ نے ی شعبی کے واسطے سے ہم سے فلاں فلاں روایتیں بیان کی تھیں، یہ سن را مام اعمش نے کہا کہ اے گروہ فقہاء تم طبیب اور ڈاکٹر واور ہم پنساری اور کیمسٹ ہیں۔

پوری روایت سند سے اس لئے ذکر کی گئی ہے کہ جن کو کچھ شک ہے وہ اس سند کی تحقیق کرلیں، ہماری تحقیق کے مطابق سند بے غبار ہے اور نصیحۃ اہل الحدیث کے محقق نے بھی سند کو صحیح کہا ہے، امام اعمش ان مختصر جملوں میں دونوں گروہ کی امتیازی خصوصیات کو بیان کردیا ہے، پنساری یا کیمسٹ دوا کے نام جانتا ہے؛ لیکن کونسی دوا کن بیماریوں میں استعمال کی جائے گی، بیماری کیا ہے، بیماری کی وجہ کیا ہے وہ کیوں کر دور ہوگی اس سے وہ بے خبر ہوتا ہے، اس کا کام صرف دواؤں کی شناخت کرنا اور ڈاکٹر کے نسخہ کے مطابق مریض کو دوا دے دینا ہے، جب کہ ڈاکٹر اور حکیم نہ صرف دوا کی خصوصیات جانتا ہے؛ بلکہ اس کی تاثیر اور افادیت سے واقف ہونے کے ساتھ مرض اور سبب مرض کا بھی علم رکھتا ہے۔

فرق محدثین کرام اور فقہاء میں ہے کہ حضرات محدثین کرام حدیث کے الفاظ، متون سے گہری واقفیت رکھتے ہیں اس میں معمولی ردوبدل اور کمی بیشی کی پوری خبر رکھتے ہیں، سند کی تبدیلیوں اور تحویلات سے واقف ہوتے ہیں؛ لیکن متن سے کن شرعی مسائل کی جانب رہنمائی مل رہی ہے، شارع کا مقصود کیا ہے، حدیث میں اصل علت کیا بیان کی گئی ہے اور اس کو کیوں کر دوسرے مسائل پر منطبق کیا جاسکتا ہے وہ اس سے ناواقف ہوتے ہیں۔

قاضی عیاض ترتیب المدارک میں امام عبداللہ بن وہب کے ترجمہ میں نقل کرتے ہیں کہ یوسف بن عدی کہتے ہیں :

قال یوسف بن عدی ادرکت الناس فقیہا غیر محدث ومحدثا

غير فقيه خلا عبد الله بن وهب ، فأني رأيته فقيها محدثا زاهدا ۔ (۱)

میں نے لوگوں کو یاتو محدث پایا یا فقیہ پایا سوائے عبداللہ بن وہب کہ میں نے ان کو محدث اور فقیہ دونوں پایا۔

اگر یہ بات درست ہوتی کہ حدیث کے ضمن میں فقاہت خود بخود حاصل ہوجاتی ہے یا پھر جو جتنا بڑا محدث وہ اتنا بڑا فقیہ تو پھر یوسف بن عدی کو فقیہ اور محدث کی تقسیم کی ضرورت کیوں پڑتی ۔ جو محدث ہوتا وہ خود بخود فقیہ ہوتا اور ان کو یہ کہنے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی کہ لوگوں کو میں نے یا تو فقیہ پایا یا محدث پایا۔

امام ترمذی کی کتاب جامع ترمذی یا سنن الترمذی سے ہر طالب علم واقف ہوگا ، ان کی کتاب ایک جانب طالب علم کو فقہاء کے متدلات اور اختلافات سے روشناس کراتی ہے تو دوسری حدیث کے مقام ومرتبہ کی بھی وضاحت کرتی ہے اور اس وجہ سے اس کتاب کو بڑی قدر و قیمت کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے۔

امام ترمذی بذات خود عظیم الشان محدث ہیں ، اس کے باوجود دیکھئے وہ ایک مسئلہ کے بارے میں کیا فرماتے ہیں :

وكذلك قال الفقهاء وهم اعلم بمعاني الحديث ۔ (۲)

اوراسی طرح فقہاء نے کہا ہے اور وہ حدیث کے معانی کو زیادہ بہتر سمجھتے ہیں ۔

امام ترمذی کا یہ اعتراف صاف صاف بتا رہا ہے کہ جس طرح الفاظ حدیث کی حفاظت کے نگہبان اور پاسبان محدثین کرام ہیں اسی طرح معانی حدیث کی نگرانی کا شرف فقہاء کرام کو حاصل ہے اور یہی بات فخر المتاخرین حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے بھی ایک مقام پر کہی ہے۔

پس اس علم کی تحصیل میں دو چیزیں لازم ہیں ، ایک تو رواۃ کے احوال کی واقفیت ، دوسرے معانی کے فہم میں بڑی احتیاط ، اس لئے کہ اگر اول الذکر میں کوتاہی ہوگی تو کذب اور صدق دونوں مختلط ہوکر رہ جائیں گے اور اگر دوسری چیز میں احتیاط نہ برتی گئی تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مراد غیر مراد کے ساتھ مشتبہ ہوجائے گا

(۱) ترتیب المدارک:3/ 231-236۔

(۲) ترمذی:1/ 118۔

اورحصول کار یہ کہ یہ علم جس مقصد کے لئے حاصل کیا جاتا ہے وہ پورانہیں ہوگا
بلکہ اس کے برعکس انسان گمراہ ہوگا اوردوسروں کو گمراہ کرے گا۔(۱)

اگر حدیث کے الفاظ اور متن کے معانی کی رہنمائی فقہاء سے حاصل نہ کی جائے تو اس کا نتیجہ اور انجام گمراہی ہوتا ہے اس کی گواہی امام عبداللہ بن وہب خود دیتے ہیں: ''لولا مالک واللیث لضللت'' (اگر مالک اور لیث نہ ہوتے تو میں گمراہ ہوجاتا)۔

اورایک دوسرے مقام پر اس کی وضاحت یوں کی ہے :

لولا ان اللہ انقذنی بمالک واللیث للضللت ، فقیل لہ کیف ذلک ؟ قال : اکثرت من الحدیث فحیرنی ، فکنت اعرض ذلک علی مالک واللیث ، فیقولان لی : خذ ھذا ودع ھذا ۔ (۲)

اگر مجھے امام مالک اورامام لیث بن سعد کی جانب سے رہنمائی نہ ملتی تو میں گمراہ ہوجاتا، پوچھا گیا وہ کیسے؟ تو فرمایا میں نے حدیث کی خوب تحصیل کی جس کے بعد متضاد حدیثوں کی وجہ سے میں حیرت میں پڑ گیا، پھر میں ان حدیثوں کو امام مالک اور لیث بن سعد کے سامنے پیش کرتا اور وہ مجھے بتاتے کہ اس پر عمل کیا جائے گا اور یہ حدیث متروک اور ناقابل عمل ہے۔

اوریہی چیز حضرت ابونعیم فضل بن دکین کو بھی پیش آئی کہ وہ احادیث کی روایت تو کرتے تھے؛ لیکن ان میں سے کونسی قابل اخذ وعمل ہے اور کونسی قابل ترک ہے اس سے لاعلم تھے اور اس باب میں ان کی رہنمائی مشہور حنفی فقیہ امام ابوزفر بن ہذیل فرماتے تھے :

قال ابونعیم الملائی الفضل بن دکین کنت امر علی زفر فیقول لی : تعال حتی اغربل لک ماسمعت ، وکنت اعرض علیہ الحدیث فیقول : ھذا ناسخ ،ھذا منسوخ ، ھذا یوخذ بہ ، ھذا یرفض ۔ (۳)

---

(۱) عجالہ نافعہ:4۔

(۲) ترتیب المدارک:3/ 231-236،التمہید لابن عبدالبر باب ذکر عیون من اخبار مالک۔

(۳) تاریخ الاسلام للذہبی:6/ 178۔

ابونعیم کہتے ہیں کہ میں امام زفرؒ کے پاس سے گزرتا تو وہ فرماتے یہاں آؤ! میں تمہارے لئے احادیث کو چھان دوں، میں ان پر سنی ہوئی احادیث پیش کرتا اور وہ فرماتے، یہ ناسخ ہے، یہ منسوخ ہے، اس پر عمل کیا جائے گا اور اسے ترک کر دیا جائے گا۔

واضح رہے کہ ابونعیم فضل بن دکین مشہور محدث ہیں اور امام یحییٰ بن معین کے ہم عصر ہیں اور علم حدیث میں ان کا مقام بہت بلند ہے، اس کے باوجود صرف احادیث کی واقفیت فقاہت کے لئے کافی نہیں ہوئی؛ بلکہ اس سلسلے میں امام ابوحنیفہؒ کے شاگرد امام زفر بن الہذیل نے ان کی رہنمائی اور دستگیری کی۔

حضرت عبداللہ بن مبارک کا مقام و مرتبہ حدیث وفقہ میں جس قدر نمایاں ہے وہ کسی سے مخفی نہیں ہے، ان کے جیسی جامع شخصیات بہت کم اور اقل قلیل ہوتی ہیں، ان سے جب پوچھا گیا کہ کوئی فتویٰ دینے کا اہل کب ہوتا ہے تو انھوں نے فرمایا: ''اذا کان عالماً بالاثر ، بصیرا بالرای'' (۱) ''جب وہ آثار سے واقف ہو اور رائے میں بصیرت اور درک رکھتا ہو''۔

اگر محض آثار سے ہی فقاہت حاصل ہو جایا کرتی تو حضرت عبداللہ بن مبارک یہ کبھی نہ فرماتے کہ فتویٰ دینے کے لئے یعنی فقاہت حاصل کرنے کے لئے رائی میں بصیرت اور گہرا رُسوخ ضروری ہے۔

محدثین کرام میں حفظ حدیث کا رواج زیادہ رہا ہے اور احادیث سے مسائل کا استنباط واخراج کم رہا ہے اس کا اعتراف امام احمد بن حنبلؒ نے بھی کیا ہے؛ چنانچہ ان سے جب مشہور محدث عبدالرزاق بن ہمام کے بارے میں پوچھا گیا کہ کیا وہ فقیہ بھی تھے تو فرمایا کہ اہل حدیث میں فقاہت بہت کم ہوتی ہے:

قال محمد بن يزيد المستملي رحمه الله تعالى : سألت أحمد عن عبد الرزاق كان له فقه ؟ فقال : ما أقل الفقه في أصحاب الحديث ۔ (۲)

اگر البانی صاحب کے بقول حدیث دانی فقاہت کا پیمانہ ہوتی تو پھر عبدالرزاق بن ہمام الصنعانی کے بارے میں امام احمد بن حنبلؒ کا جواب مختلف ہوتا، اس کے برعکس وہ فرماتے ہیں کہ اہل حدیث میں فقاہت بہت کم ہوتی ہے۔

---

(۱) جامع بیان العلم وفضلہ: 818 وسندہ لاباس بہ کما قال المحقق۔

(۲) طبقات الحنابلة لابن أبي يعلیؒ: 2/392، تحقيق: العثيمين۔

جب امام احمد بن حنبلؒ کا ذکر چل نکلا ہے تو یاد ش بخیر یہ بھی تازہ کر لیں کہ علم حدیث میں امام احمد بن حنبلؒ کا مقام ومرتبہ امام شافعی سے بہت زیادہ ہے حتیٰ کہ امام شافعی ان سے علم حدیث میں مدد طلب کرتے تھے؛ لیکن کسی نے یہ نہیں کہا کہ فقہ میں امام احمدؒ کا مرتبہ ومقام امام شافعی سے زیادہ بلند ہے، امام شافعیؒ کی فقاہت میں برتری اور علو مقام کا اعتراف خود امام احمد بن حنبلؒ کو تھا، جس کی تفصیل کتب سوانح وتراجم میں موجود ہے۔

خطیب بغدادی بڑے محدث ہیں اور اپنے زمانہ کے بلند مرتبت فقہاء سے انھوں نے فقہ کی تحصیل کی ہے، ایک طرف انھوں نے محدث کے دفاع میں شرف اصحاب الحدیث نامی رسالہ لکھا تو دوسری جانب محدثین کرام کو فقہ کی عظمت بتاتے ہوئے اس کی تحصیل کی ترغیب کے لئے نصیحۃ اہل الحدیث نامی کتاب بھی لکھی۔

خطیب بغدادی صاف اور صریح الفاظ میں بغیر کسی لگی لپٹی کے کہتے ہیں کہ کتب حدیث کے جمع کرنے یا اس کی روایت کرنے سے کوئی فقیہ نہیں بن جاتا؛ بلکہ اس کے لئے احادیث کے معنی ومراد میں غور وفکر کرنا ضروری ہوتا ہے:

وليعلم ان الاكثار من كتب الحديث و روايته لا يصير بها الرجل فقيها ، انما يتفقه باستنباط معانيه و انعام التفكر فيه ۔ (۱)

اور جاننا چاہئے کہ کتب حدیث کی کثرت اور اس کی روایت سے آدمی فقیہ نہیں ہوجاتا ہے، آدمی فقیہ تب ہوتا ہے جب کہ اس کے اندر احادیث سے معانی کے استنباط اور اس میں غور وفکر کی صلاحیت پائی جاتی ہو۔

اب آخر میں کچھ باتیں فقہ کے تعلق سے بھی عرض کردوں، دیکھئے ایک چیز ہے معلومات اور ایک چیز ہے اس سے نتائج کا استنباط، ایک سائنس کے طالب علم کو موجودہ دور میں شاید نیوٹن سے زیادہ معلومات ہوں گی؛ لیکن نیوٹن کی طرح وہ کوئی چیز ایجاد نہیں کرسکتا، وجہ صرف یہ ہے کہ اس کے اندر معلومات سے کام لینے کی صلاحیت نہیں ہے، اس کے اندر تجسس کا جذبہ اتنا نہیں ہے جتنا نیوٹن میں تھا، آپ ایک شخص کو ہر چیز پڑھا سکتے ہیں؛ لیکن اس کے بعد بھی معاملہ یہی ہوگا کہ اس کو اپنی ذہانت سے کام لینا ہوگا۔

---

(۱) شرف اصحاب الحدیث ونصیحۃ اھل الحدیث:252۔

ایک واقعہ

کسی بادشاہ کا ایک بیٹا تھا بہت کند ذہن، بادشاہ نے سوچا کہ اسے ایسا کونسا علم سکھادوں جس کے بعد یہ خطرات سے محفوظ ہوجائے اور اپنی غباوت ذہنی سے کسی حادثہ اور مکار شخص کی چالا کی کا شکار نہ ہو، آخر اس کے ذہن میں آیا کہ اس کو علم نجوم سکھا دیتا ہوں جس سے اس کو پیشگی خطرات معلوم ہوجایا کریں گے، اور یہ اپنا تحفظ کرلے گا، ماہر نجومیوں کو اپنے بیٹے کی تعلیم پر مقرر کردیا، ایک عرصہ کے بعد نجومیوں نے بادشاہ سے عرض کیا کہ ہم نے اس کو سب کچھ سکھا دیا ہے، آپ اس کا چاہیں تو امتحان لے سکتے ہیں، بادشاہ نے اپنی مٹھی میں انگوٹھی چھپائی اور بیٹے سے پوچھا کہ بتاؤ! میں نے اپنی مٹھی میں کیا چھپایا ہے، اس نے حساب لگایا اور کہا کہ کوئی گول سی چیز ہے، بادشاہ نے پوچھا کہ وہ گول سی چیز کیا ہوسکتی ہے؟ بیٹا نے جواب دیا کہ بیل گاڑی کا پہیہ۔

نجومیوں کے سکھانے کا تعلق جہاں تک تھا انھوں نے سکھا دیا اور اس نے بتا بھی دیا کہ وہ گول سی چیز ہوسکتی ہے، اب وہ گول سی چیز کیا ہوسکتی ہے اس کا تعلق ذہانت سے تھا اور کوئی بھی ذہین شخص قرائن اور اشارات سے انگوٹھی تجویز کرسکتا تھا۔

اسی طرح ہم عرض کرتے ہیں کہ حدیث کا علم بہت اہمیت رکھتا ہے اور محدثین کرام اور ناقلین عظام نے اپنی جانب سے بڑی خدمات انجام دیں ہیں جزاھم اللہ خیراً؛ لیکن صرف یہی چیز اس کے لئے کافی نہیں ہوسکتی کہ وہ فقیہ بن جائیں، فقیہ بننے کے لئے اس کے علاوہ دیگر علوم کی بھی ضرورت پڑتی ہے، اور یہی وجہ تھی کہ امام احمد بن حنبل نے باوجود علم حدیث میں امام شافعی سے آگے ہونے کے امام شافعی کی شاگردی اختیار کی، اور یہی وجہ ہے کہ باوجود علم حدیث کے سرخیل اور امام ہونے کے اور تمام احادیث سے واقفیت رکھنے کے عبدالرحمٰن بن مہدی نے امام شافعی سے گزارش کی تھی کہ وہ اُصولِ فقہ پر کتاب لکھیں۔

امام شافعی نے جن احادیث سے اُصولِ فقہ پر استدلال کیا ہے اور باطل فرقوں کے دعووں کو رد کیا ہے کیا وہ احادیث امام احمد بن حنبل اور امام عبدالرحمٰن بن مہدی کے علم میں نہ تھیں؟ یقیناً تھیں اور اس کے طرق اور متابعات سے وہ امام شافعی سے کہیں زیادہ واقف تھے؛ لیکن ان سے استدلال کس طرح کیا جائے، یہ امام شافعی کے فقیہانہ ذہن نے طے کیا۔

ایک اور مثال ذکر کردوں :

علی بن مسہر کہتے ہیں کہ امام ابوحنیفہ کی مجلس لگی ہوئی تھی، عبداللہ بن مبارک آئے

اور یہ مسئلہ پوچھا کہ ایک شخص ہانڈی پکارہا تھا کہ ایک چڑیا اس میں گری اور مرگئی، تو اس کا کیا حکم ہوگا؟ امام ابوحنیفہ نے اپنے شاگردوں اور مجلس میں موجود لوگوں سے مسئلہ بتانے کو کہا، انھوں نے حضرت ابن عباس کی روایت بیان کی کہ شوربہ کو بہادیا جائے گا اور گوشت کھالیا جائے گا، امام ابوحنیفہ نے فرمایا کہ ہم بھی یہی کہتے ہیں؛ لیکن ایک شرط کے ساتھ، وہ شرط یہ ہے کہ اگر ہانڈی حالت جوش میں نہ ہو یعنی ہانڈی کے اندر پک رہا شوربہ خوب گرم نہ ہو تو اسی روایت پر عمل ہوگا؛ لیکن اگر شوربہ بہت گرم ہوگا تو پھر شوربہ بھی بہادیا جائے گا اور گوشت بھی نہیں کھایا جائے گا اور اس کی وجہ یہ ہے کہ سکون کی حالت میں چریا کے گرنے سے ہانڈی میں موجود گوشت کے ٹکروں پر کوئی اثر نہیں پڑتا؛ لیکن اگر ہانڈی اُبل رہی ہو تو جو شوربہ مردہ چڑیا کے اعضا سے لگے گا وہ ہانڈی میں موجود گوشت کے ٹکروں میں اندرتک سرایت کرجائے گا جیسا کہ سرکہ اور پانی سرایت کرجاتا ہے، اس لئے گوشت اور شوربہ دونوں کو ضائع کردیا جائے گا، یہ سن کر حضرت عبداللہ بن مبارک نے فرمایا: ''رزین، رزین'' فارسی کا جملہ ہے اس کا معنی سونے کے ہیں۔(۱)

مطلب یہ ہے کہ یہ کلام سونے کے مثل ہے، جیسا کہ آج بھی ہم کسی اچھی بات پر کہتے ہیں کہ اسے سونے کے پانی سے لکھا جانا چاہئے، تو جیسا کہ روایت ہر ایک کو معلوم تھی؛ لیکن اس میں کیا قید چھپا ہوا ہے اور اس کو کس طرح نافذ کرنا ہے، یہ امام ابوحنیفہ کے فقیہانہ ذہن نے طے کیا۔

علاوہ ازیں فقیہ کے لئے نص کی دلالت، اشارہ، اقتضاء وغیرہ بھی جاننا ضروری ہے، عربی زبان سے اچھی طرح واقفیت بھی ضروری ہے، ناسخ ومنسوخ کا علم بھی ضروری ہے، اس کے علاوہ قیاس، تعلیل، مناط حکم، وجوہ تخریج، عرف، عادت، استصحاب، مصلحت عامہ، ان سب چیزوں کو جاننا ضروری ہے، جب کہ ان اُمور کا جاننا ایک محدث کے لئے ضروری نہیں ہے۔

---

(۱) الانتقاء:304۔

امام اعمشؒ اور امام ابوحنیفہؒ کی فقاہت کا اعتراف

ماقبل میں امام اعمش کی زبانی امام ابوحنیفہ کی فقاہت کا اعتراف نقل کیا گیا جس میں انھوں نے صاف اور واضح لفظوں میں اعتراف کیا کہ امام ابوحنیفہ فقیہ ہیں اور صرف محدث ہیں،فقہاء کی حیثیت طبیب اور ڈاکٹر کی ہے اور محدثین کی حیثیت کیمسٹ اور پنساری کی ہے۔

پاکستان میں اہل حدیث حضرات کے ایک بڑے عالم دین مولانا ارشادالحق اثری صاحب ہیں،آپ ایک مدرسہ کے شیخ الحدیث اور بہت ساری کتابوں کے مصنف بھی ہیں اور اہل حدیث کے معتاد سخت لب ولہجہ کے برعکس آپ کی تحریریں متعدل ہوتی ہیں،شیخ محمد عوامہ محتاج تعارف نہیں ہے،ان کی ایک کتاب اثر الحدیث الشریف فی اختلاف الفقہاء جب آئی تو اس پر بعض اہل حدیث حضرات نے سخت تنقید کی،اور کتاب کے مضمون کے علاوہ بعض حضرات نے کتاب کے نام پر بھی نقد کیا اور کہا کہ یہ اس کتاب کے نام سے پتہ چلتا ہے کہ اختلاف کا باعث حدیث نبوی ہے،جب کہ حدیث تو اتفاق واتحاد کی بنیاد ہے،یہ اعتراض کرنے والوں میں مولانا ارشادالحق اثری صاحب بھی شامل تھے،آپ نے اثر الحدیث الشریف کے نقد پر مستقل ایک کتاب لکھی، اس کتاب کا نام ہے''اسباب اختلاف الفقہاء''(حقیقی اور مصنوعی عوامل)اس میں بھی آپ نے امام اعمش کی زبانی امام ابوحنیفہ کی فقاہت کی تعریف سے انکار کیا ہے اور راوی حدیث حمانی وغیرہ کی روایت ذکر کرکے کہا ہے کہ اس کی سند درست نہیں ہے،مذکورہ بالا تحریر اسی اعتراض کے رد میں ہے،انھوں نے پہلے تو امام ابوحنیفہ اور امام اعمش کے وہ واقعات لکھے ہیں جو معاصرانہ چشمک پر مبنی ہیں اور پھر اسی واقعہ کے متعلق کچھ غیر صحیح سندوں کو ذکر کرکے کلی طور پر حکم لگادیا ہے کہ امام اعمش نے امام ابوحنیفہؒ کی فقاہت کی کوئی تعریف نہیں کی ہے :

حَدَّثَنِي عَبْدَةُ بْنُ عَبْدِ الرَّحِيمِ ، سَمِعْتُ مُعَرَّفًا ، يَقُولُ : دَخَلَ اَبُو حَنِيفَةَ عَلَى الْأَعْمَشِ يَعُودُهُ فَقَالَ : يَا اَبَا مُحَمَّدٍ لَوْلَا اَنْ يَثْقُلَ ، عَلَيْكَ مَجِيئِي لَعُدْتُكَ فِي كُلِّ يَوْمٍ ، فَقَالَ الْأَعْمَشُ : مَنْ هَذَا ؟ قَالُوا : اَبُو حَنِيفَةَ ، فَقَالَ : ''يَا ابْنَ النُّعْمَانِ اَنْتَ وَاللّٰهِ ثَقِيلٌ فِي مَنْزِلِكَ فَكَيْفَ إِذَا جِئْتَنِي''۔ (۱)

---

(۱) السنۃ لعبداللہ بن أحمد: 1/190 واسنادہ صحیح۔

یعنی امام اعمشؒ کے شاگرد معرف بن واصلؒ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ ابوحنیفہؒ امام اعمشؒ کی عیادت کرنے کے لئے آئے اور کہا: ''اے اعمش! اگر میرا آپ کے پاس آنا آپ کو بوجھ نہ لگتا تو میں تو روز آنہ آپ کی عیادت کرتا'' امام اعمش نے کہا: یہ کون آ گیا؟ لوگوں نے کہا یہ ابوحنیفہ صاحب ہیں، یہ سن کر امام اعمشؒ نے کہا: اے نعمان کے بچے! اللہ کی قسم تو تو اپنے گھر میں بھی بوجھ بنا ہوا ہے پھر میرے پاس آئے گا تو بوجھ کیوں نہیں بنے گا۔

اس خبر کی پوری تفصیل جامع بیان العلم وفضلہ میں ابن عبدالبر نے ذکر کی ہے :

اَخْبَرَنَا اَحْمَدُ بْنُ عَبْدِ اللهِ ، نا مَسْلَمَةُ بْنُ الْقَاسِمِ ، نا اَحْمَدُ بْنُ عِيسَى ، نا مُحَمَّدُ بْنُ اَحْمَدَ بْنِ فَيْرُوزَ ، نا عَلِيُّ بْنُ خَشْرَمٍ قَالَ : سَمِعْتُ الْفَضْلَ بْنَ مُوسَى يَقُولُ : دَخَلْتُ مَعَ اَبِي حَنِيفَةَ عَلَى الْأَعْمَشِ نَعُودُهُ فَقَالَ لَهُ اَبُو حَنِيفَةَ : يَا اَبَا مُحَمَّدٍ ، لَوْلَا التَّثْقِيلُ عَلَيْكَ لَتَرَدَّدْتُ فِي عِيَادَتِكَ اَوْ قَالَ : لَعُدْتُكَ اَكْثَرَ مِمَّا اَعُودُكَ ، فَقَالَ لَهُ الْاَعْمَشُ: وَاللهِ إِنَّكَ لَثَقِيلٌ وَاَنْتَ فِي بَيْتِكَ فَكَيْفَ إِذَا دَخَلْتَ عَلَيَّ ؟ قَالَ الْفَضْلُ : فَلَمَّا خَرَجْنَا مِنْ عِنْدِهِ قَالَ اَبُو حَنِيفَةَ : إِنَّ الْاَعْمَشَ لَمْ يَصُمْ رَمَضَانَ قَطُّ وَلَمْ يَغْتَسِلْ مِنْ جَنَابَةٍ ، فَقُلْتُ لِلْفَضْلِ : مَا يَعْنِي بِذَلِكَ ؟ قَالَ : كَانَ الْاَعْمَشُ يَرَى الْمَاءَ مِنَ الْمَاءِ وَيَتَسَحَّرُ عَلَى حَدِيثِ حُذَيْفَةَ ۔ (۱)

اس میں یہ بھی ذکر ہے کہ فضل بن موسی السینانی کہتے ہیں کہ جب ہم اعمش کے پاس سے باہر نکلے تو امام ابوحنیفہ نے فرمایا، اعمش نے نہ کبھی رمضان کا روزہ رکھا اور نہ ہی غسل جنابیت کیا، علی بن خشرم کہتے ہیں کہ میں نے فضل بن موسیٰ سے پوچھا کہ ابوحنیفہ کی اس بات سے کیا مراد تھی تو فرمایا کہ اعمش الماء من الماء کے

(۱) جامع بیان العلم وفضلہ:1107۔

قائل تھے اور حضرت حذیفہ کی حدیث پر سحری کھایا کرتے تھے، (الماء من الماء واضح طور پر منسوخ ہے اور کچھ یہی حال حدیث حذیفہ فی السحر کا بھی ہے)۔

ویسے بھی اس پورے کلام سے صرف اتنا معلوم ہورہا ہے کہ دونوں حضرات کے دل ایک دوسرے سے صاف نہ تھے اور روایات میں تطبیق کا جائزہ لیا جائے تو یہ ممکن ہے کہ شروع میں امام ابوحنیفہ کے خلاف پروپیگنڈہ کی وجہ سے امام اعمش کا دل امام ابوحنیفہ سے صاف نہ ہوا اور ان کو ان سے گرانی ہو؛ لیکن بعد میں جب ان کو امام ابوحنیفہؒ کے تعلق سے حقیقت کا پتہ چلا تو انھوں نے اپنی مجلس میں امام ابوحنیفہ سے مسائل بھی دریافت کرنے شروع کردیے۔

واقعہ کیا ہے؟

امام اعمشؒ کی مجلس میں کسی نے کوئی فقہی سوال کیا تو انھوں نے امام ابوحنیفہ سے پوچھا، یا پھر خود اعمش نے امام ابوحنیفہؒ سے دریافت کیا کہ فلاں فلاں مسئلہ میں آپ کیا کہتے ہیں تو امام ابوحنیفہ نے جواب دیا، امام اعمش نے دریافت کیا کہ اس کی دلیل کیا ہے تو فرمایا کہ اپ نے ہی تو فلاں فلاں موقع پر فلاں فلاں حدیثیں بیان کی تھیں، اسی سے ہم نے یہ مسائل مستنبط کئے، اس پر امام اعمش نے فرمایا: ''اے گروہ فقہاء تو طبیب ہو اور ہم تو پنساری ہیں''۔

یہ واقعہ کئی اہل علم نے ذکر کیا ہے، آیئے ذرا اس کا جائزہ لیتے چلیں کہ یہ واقعہ مردود سند سے روایت کی گئی ہے یا پھر اس کا کوئی حقیقی اور واقعی وجود بھی ہے۔

اس واقعہ کو امام صیمری نے اپنی کتاب اخبار ابی حنیفۃ واصحابہ میں نقل کیا ہے؛ چنانچہ ملاحظہ کیجئے:

أخبرنَا عبد الله بن مُحَمَّد قَالَ ثَنَا مكرم قَالَ ثَنَا احمد بن عَطِيَّة قَالَ ثَنَا عَليّ بن معبد قَالَ ثَنَا عبيد الله بن عمر قَالَ كُنَّا عِنْد الْاَعْمَش وَهُوَ يسْأَل اَبَا حنيفَة عَن مسَائِل ويجيبه ابوحنيفَة فَيَقُول لَهُ الْاَعْمَش من اَيْن لَك هَذَا فَيَقُول انت حَدَّثتنَا عَن إِبْرَاهِيم بِكَذَا وحدثتنا عَن الشّعبِيّ بِكَذَا قَالَ فَكَانَ الْاَعْمَش عِنْد ذَلِك يَقُول يَا معشر الْفُقَهَاء اَنْتُم الْاَطِبَّاء وَنحن الصيادلة۔ (۱)

(۱) اخبار ابی حنیفۃ واصحابہ: 1/27۔

عبیداللہ بن عمر کہتے ہیں کہ ہم اعمش کے پاس تھے اور وہ امام ابوحنیفہ سے کچھ
مسائل دریافت کرر ہے تھے اورامام ابوحنیفہ جواب دے رہے تھے تو ان سے
اعمش نے کہا کہ آپ کی دلیل کیا ہے تو فرمایا آپ نے ہم سے ابراہیم کی سند سے
شعبی کی سند سے ایسی ایسی روایت بیان کی تھی اسی سے ہم نے یہ مسائل مستنبط
کئے ہیں ،تواس وقت امام اعمش نے کہا اے گروہ فقہاء تو ڈاکٹر اور طبیب ہو
اور ہم پنساری اور کیمسٹ ہیں۔

اس واقعہ کی سندیوں تو درست ہے؛لیکن درمیان میں احمد بن عطیہ ہے ان پر محدثین نے سخت جرح کی ہے ،مطلب یہ کہ ان پر کذب اور وضع حدیث کا بھی الزام ہے ؛ لہٰذا اس راوی کی وجہ سے یہ واقعہ قابل استدلال نہیں رہ گیا ہے،ویسے اس واقعہ میں راوی نے امام اعمش سے روایت کرنے والے کا نام عبیداللہ بن عمر بتایا ہے جب کہ دیگر تمام روایتوں میں اس راوی کا نام عبیداللہ بن عمرو بتایا گیا ہے۔

اس واقعہ کا ذکر ابن عبدالبر نے جامع بیان العلم وفضلہ میں کیا ہے؛چنانچہ وہ لکھتے ہیں :

اخبرنی خلف بن قاسم ، ثنا محمد بن القاسم بن شعبان ،
حدثنا ابراهیم بن عثمان بن سعید ، ثنا علان بن المغیرہ ،
ثنا علی بن معبد بن شداد ، ثنا عبید الله بن عمرو ، قال :
کنت فی مجلس الاعمش فجاءہ رجل فساله عن مسالة فلم
یجبه فیها ، ونظر فاذا ابو حنیفة فقال : یانعمن قل فیها ، قال :
القول فیها کذا ، قال من این ؟ قال : من حدیث حدثتناہ ،
قال فقال الاعمش : نحن الصیادلة وانتم الاطباء ۔ (۱)

عبیداللہ بن عمرو کہتے ہیں میں اعمش کی مجلس میں تھا تو ایک شخص نے ان سے کوئی
مسئلہ دریافت کیا تو انھوں نے جواب نہیں دیا اور نگاہ دوڑائی تو امام ابوحنیفہ کو مجلس
میں موجود پایا تو فرمایا اے نعمان اس مسئلہ کے متعلق جواب دیں تو انھوں نے

(۱) جامع بیان العلم وفضلہ:130۔

> جواب دیا، اس پر اعمش نے مسئلہ کی دلیل دریافت کی تو فرمایا اسی حدیث سے جو آپ نے بیان کیا تھا اس پر اعمش نے کہا کہ ہم پنساری ہیں اور تم اطباء ہو۔

اس روایت کے بارے میں مولانا ارشاد الحق اثری لکھتے ہیں :

> علامہ ابن عبد البرؒ نے اسی نوعیت کا ایک واقعہ جامع بیان العلم :2/ 131 میں ذکر کیا ہے ؛ لیکن اس کی سند بھی ضعیف ہے ؛ چنانچہ اس میں ابراہیم بن عثمان بن سعید مجہول ہے، (۱) اس کے استاذ علان بن المغیر ہ کا ترجمہ کوشش کے باوجود کہیں نہیں ملا۔

اس روایت کی سند کا ترتیب وار جائزہ راوی کے اعتبار سے جائزہ لیتے ہیں ؛ تاکہ پتہ چلے کہ سند کس درجے کی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ نہ ابراہیم بن عثمان بن سعید مجہول ہیں اور نہ ہی علان بن المغیرہ کوئی گمنام شخصیت ہیں، یہ سب صرف تحقیق کی کمی اور کوتاہی ہے، جس کو ہم ذیل میں واضح کریں گے۔

خلف بن قاسم

آپ ثقہ ہیں، بکثرت روایت کرنے والے محدث اور حافظ حدیث تھے : ''كان محدثاً مكثراً حافظاً''۔(۲)

اس کے علاوہ الدیباج المذہب فی معرفۃ أعیان علماء المذہب : 1/ 355 میں بھی آپ کو الحافظ کے لقب سے یاد کیا گیا ہے۔

محمد بن القاسم بن شعبان

آپ مسلک مالکی سے انتساب رکھتے ہیں اور مالکیہ فقہاء میں بڑے مقام ومرتبہ کے مالک ہیں، حافظ ذہبی نے ابن حزم سے آپ کی تضعیف نقل کی ہے :

> ابن شعبان في المالكية نظير عبد الباقي بن قانع في الحنفيّين، قد تأمّلنا حديثهما فوجدنا فيه البلاء المبين والكَذِب البَحْت

(۱) لسان :1/ 85۔

(۲) بغية الملتمس في تاريخ رجال أهل الأندلس : 286۔

والوَضْع ، فإمّا تغيّر حفظهما وإما اختلطت كُتُبُهما . (۱)

اورخود بھی حافظ ذہبی فرماتے ہیں :

ولم يكن بالمُتْقِن للأثر مع سعة علمه . (۲)

لیکن یہ بات واضح رہنی چاہئے کہ اتقان الگ چیز ہے اور روایت میں قابل اعتماد ہونا دوسری بات ہے، اگر کوئی شخص متقن اور حافظ نہیں ہے؛ لیکن صداقت سے متصف ہے تو بھی اس کی روایت قابل قبول ہوگی، یہاں حافظ ذہبی نے اتقان کی نفی کی ہے، صدوق ہونے کی نفی نہیں کی ہے اور جہاں تک بات ابن حزم کے جرح کی ہے تو میزان الاعتدال جو حافظ ذہبی کے آخر عمر کی تصانیف میں سے ایک ہے، اس میں حافظ ذہبی فرماتے ہیں :

محمد بن القاسم بن شعبان ، ابو إسحاق المصري المالكي الفقيه ، وهاه أبو محمد بن حزم ، ما أدري لماذا ؟ (۳)

ابن حزم نے جو ابن شعبان کو ضعیف قرار دیا ہے، اس کا باعث اور وجہ مجھ پر واضح نہیں ہے۔

اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس راوی پر سوائے ابن حزم کے کسی نے بھی جرح نہیں کیا ہے، اور ابن حزم جرح میں جلد باز ہیں معروف حضرات کو بھی مجہول کہہ دیتے ہیں اور اسی کے ساتھ متشدد ہیں اور ساتھ ہی یہ کہ اس جرح باعث کیا ہے، یہ حافظ ذہبی جیسے استقراء تام والے محدث پر بھی واضح نہیں ہے۔

ابراہیم بن عثمان بن سعید

ابن حزمؒ نے حسب عادت ان کو بھی مجہول قرار دیا ہے؛ (۴) لیکن ابن یونسؒ جنھوں نے آپ سے حدیث لکھی ہے، وہ آپ کو صالح الحدیث کہتے ہیں :

قال ابن يونس : كتبت عنه وكان صالح الحديث ۔ (۵)

اور ابن یونسؒ کی اسی بات کو ابن عساکرؒ نے بھی برضا ورغبت دوہرایا ہے۔ (۶)

---

(۱) تاریخ الاسلام تبشار: 8/89۔ (۲) حوالۂ سابق۔
(۳) میزان الاعتدال: 4/14۔ (۴) لسان المیزان أبی غدہ: 1/317۔
(۵) **الثقات ممن لم يقع في الكتب الستة**: 2/214۔ (۶) تاریخ دمشق لابن عساکر: 7/51۔

علان بن المغیرہ

آپ کے بارے میں مولانا ارشاد الحق اثری لکھتے ہیں :

اس کے استاذ علان بن المغیرہ کا ترجمہ کوشش کے باوجود کہیں نہیں ملا۔

حقیقت یہ ہے کہ اسماء رجال کی کئی کتابوں میں علان بن مغیرہ کا ترجمہ دستیاب ہے، ہاں علان ان کا لقب ہے، نام نہیں ہے، نام سے تلاش کی صورت میں یقیناً ناکامی ہاتھ آئے گی، آپ کا نام علی، والد کا نام عبدالرحمٰن اور لقب یا مشہور نام علان ہے، آپ کے بارے میں حافظ ذہبی فرماتے ہیں :

عَلاَّنُ عَلِيُّ بنُ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ المَخْزُوْمِيُّ (س) الإِمَامُ ، الحَافِظُ ، المُتْقِنُ ، النَّبِيْلُ ، اَبُو الحَسَنِ ، عَلِيُّ بنُ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بنِ مُحَمَّدِ بنِ المُغِيْرَةِ المَخْزُوْمِيُّ المِصْرِيُّ ، عَلاَّنُ . (۱)

عليّ بُن عَبْد الرَّحْمٰن بُن محمد بُن المغيرة المخزوميّ المِصْريُّ عَلان ، أبو الحسن [الوفاة:271-280ھ] محدث رحال نبيل ، أغفله أبو سَعِيد بْن يُونُس ، سَمِعَ : آدم بْن أبي إياس ، وخلّاد بْن يحيى ، وعبد الله بن يوسف التنيسي ، وسعيد بن أبي مريم ، وطبقتهم ، وَعَنْهُ : أبو جَعْفَر الطَّحاويّ ، وأبو عليّ بْن حبيب الحصائريّ ، وأبو بَكْر بْن زياد النَّيْسَابوريُّ ، وأحمد بْن مَسْعُود الزَّنْبرِيّ ، وأبو عليّ بْن فَضَالَةَ ، ومحمد بْن يوسف الهرويّ ، وجماعة ، وقد روى أبو عَبْد الرَّحْمٰن النَّسائِيّ فِي كتاب اليوم واللّيلة حديثًا عن زكريّا خيّاط السنة ، عَنْهُ ، قَالَ الطَّحاويّ : تُوُفِّيَ فِي شعبان سنة اثنتين وسبعين . (۲)

اور امام دارقطنی فرماتے ہیں :

ولعبد الرحمٰن ابن يقال له علي بن عبد الرحمٰن ، يلقب

(۱) سیر أعلام النبلاء الرسالۃ:13/141۔

(۲) تاریخ الاسلام تبشار:6/580۔

بعلان ، حدث عنه أبو بكر النيسابوري وابن صاعد وغيرهما ، وحمزة بن المغيرة عمهما . (۱)

اورمشہور محدث مغلطائی آپ کے بارے میں لکھتے ہیں :

ذكره ابن حبان في كتاب ''الثقات'' ، وخرج حديثه في ''صحيحه'' ، وكذلك أستاذه ابن خزيمة روى عنه في ''صحيحه'' ، وروى عن : عمرو بن الربيع بن طارق في ''مستدرك'' الحاكم ، وأبي زهير محمد بن إسحاق المروزي في كتاب ''الألقاب'' للشيرازي ، وفي قول المزي : لم يذكره أبو سعيد بن يونس في ''تاريخ مصر'' ولا في ''الغرباء'' نظر ؛ لثبوته في أصل ''التاريخ'' لابن يونس وها أنا أذكر كلامه بنصه قال : علي بن عبد الرحمٰن بن محمد بن المغيرة بن نشيط يكنى أبا الحسن ولد بمصر وكتب الحديث وحدث وكان ثقة حسن الحديث ، توفي بمصر يوم الخميس لعشر خلون من شعبان سنة اثنتين وسبعين ومائتين . (۲)

اورمشہورامام جرح وتعدیل ابن ابی حاتم آپ کے بارے میں لکھتے ہیں:''كتبت عنه بمصر وهو صدوق''۔(۳)

اورمتاخرین میں سب سے بڑے حافظ الحدیث حافظ ابن حجر فرماتے ہیں :

علي ابن عبد الرحمٰن ابن محمد ابن المغيرة المخزومي مولاهم المصري لقبه علان بفتح المهملة وتشديد اللام

(۱) موسوعۃ أقوال أبي الحسن الدارقطني فی رجال الحدیث وعللہ :2/ 466۔

(۲) إکمال تہذیب الکمال:9/ 359۔

(۳) تاریخ دمشق لابن عساکر:43/ 68۔

وكان أصله من الكوفة صدوق من الحادية عشرة مات سنة اثنتين وسبعين ۔ (۱)

خلاصہ کلام یہ کہ علی بن عبدالرحمٰن المعروف بہ علان کوئی غیر معروف شخصیت نہیں ہیں، محدثین کرام کے نزدیک معروف ہیں، اور کتب جرح وتعدیل میں کا تذکرہ موجود ہے، بالخصوص تقریب التہذیب جس پر عموماً اہل علم کا مدار ہے، اس میں بھی آپ کا تذکرہ موجود ہے، اس کے باوجود ارشاد الحق اثری صاحب کا یہ کہنا کہ مجھے تلاش کے باوجود آپ کا ترجمہ نہیں ملا، حیرت میں ڈالنے والی بات ہے۔

علی بن معبد

آپ کی ثقاہت محدثین کے نزدیک تقریباً متفق علیہ ہے، مشہور محدث اور جرح وتعدیل کے امام ابن حبان آپ کے بارے میں فرماتے ہیں :

علي بن معبد بن شَدَّاد الْعَبْدي من أهل مصر يروي عَن اللَّيْث بن سعد وَعبيد الله بْن عَمْرو رَوَى عَنْهُ المصريون مُسْتَقِيم الحَدِيث ۔ (۲)

مشہور محدث اور مستدرک کے مصنف حاکم آپ کے بارے میں فرماتے ہیں :

قال الحاكم هو شيخ من جلة المحدثين ۔ (۳)

مشہور ناقد رجال ابوحاتم آپ کے بارے میں کہتے ہیں :

عبد الرحمٰن قال سألت ابی عنه فقال ثقة ۔ (۴)

مشہور محدث اور ناقد رجال عجلی نے آپ کا تذکرہ کتاب الثقات میں کرتے ہوئے آپ کو ثقہ اور صاحب سنۃ قرار دیا ہے :

علي بن معبد : يكنى أبا الحسن ، سكن مصر ''ثقة'' صاحب سنة ۔ (۵)

---

(۱) تقریب التہذیب:403۔
(۲) الثقات لابن حبان:8/467۔
(۳) تہذیب التہذیب:7/385۔
(۴) الجرح والتعدیل لابن أبی حاتم:6/205۔
(۵) الثقات للعجلي ط الباز:351۔

علاوہ ازیں ابن خزیمہ نے اپنی صحیح میں آپ سے روایت کی ہے، جس سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے نزدیک آپ ثقہ راوی ہیں۔(۱)

حافظ ذہبی آپ کے بارے میں کہتے ہیں :

عَلِيُّ بنُ مَعْبَدِ بنِ شَدَّادٍ العَبْدِيُّ الرَّقِّيُّ الإِمَامُ ، الحَافِظُ ، الفَقِيْهُ ، أَبُو الحَسَنِ ، وَأَبُو مُحَمَّدٍ العَبْدِيُّ الرَّقِّيُّ ، نَزِيْلُ مِصْرَ ، مِنْ كِبَارِ الائِمَّةِ . (۲)

اس کے علاوہ کاشف میں بھی حافظ ذہبی نے علی بن معبد کو ثقہ قرار دیا ہے۔

ان تمام نقول سے یہ بات ثابت ہوجاتی ہے کہ علی بن معبد ثقہ راوی ہیں اوران کی ثقاہت کا قول ہی معتبر ہے۔

عبیداللہ بن عمروالرقی

آپ صحاح ستہ کے راوی ہیں اور آپ کی ثقاہت متفق علیہ ہے، ابن سعد آپ کو ثقہ، صدوق، کثیر الحدیث اور عبدالکریم جزری سے روایت کرنے والوں میں سب سے زیادہ ثقہ قرار دیتے ہیں :

عُبَيْدُ اللهِ بْنُ عَمْرِو بْنِ أَبِي الْوَلِيدِ الأَسَدِيُّ مَوْلًى لَهُمْ ، وَيُكْنَى أَبَا وَهْبٍ ، وَكَانَ ثِقَةً ، صَدُوقًا ، كَثِيرَ الْحَدِيثِ ، وَرُبَّمَا أَخْطَأَ ، وَكَانَ أَحْفَظَ مَنْ رَوَى عَنْ عَبْدِ الْكَرِيمِ الْجَزَرِيِّ ، وَلَمْ يَكُنْ أَحَدٌ يُنَازِعُهُ فِي الْفَتْوَى فِي دَهْرِهِ ، وَمَاتَ بِالرَّقَّةِ سَنَةَ ثَمَانِينَ وَمِائَةٍ ، فِي خِلافَةِ هَارُونَ ۔ (۳)

امام جرح وتعدیل ابن معین نے آپ کو ثقہ قرار دیا ہے، امام نسائی نے آپ کو ثقہ قرار دیا ہے، امام ابوحاتم نے نہ صرف آپ کو ثقہ قرار دیا ہے؛ بلکہ لکھا ہے کہ آپ کی کوئی بھی حدیث منکر نہیں ہے، حافظ ذہبی آپ کو الحافظ الکبیر قرار دیتے ہیں :

---

(۱) إكمال تهذيب الكمال: 9/ 377۔

(۲) سیر أعلام النبلاء، ط: الرسالة: 10/ 631۔

(۳) طبقات ابن سعد: 7/ 484۔

عُبَيْدُ اللهِ بنُ عَمْرِو بنِ اَبِي الوَلِيْدِ الاَسَدِيُّ مَوْلاَهُم (ع) الرَّقِّيُّ ، الحَافِظُ الكَبِيْرُ ، اَبُو وَهْبٍ ، كَانَ ثِقَةً ، حُجَّةً ، صَاحِبَ حَدِيْثٍ ، وَثَّقَهُ : ابْنُ مَعِيْنٍ ، وَالنَّسَائی ، وَقَالَ اَبُو حَاتِمٍ : ثِقَةٌ ، صَدُوْقٌ ، لاَ اَعْرِفُ لَهُ حَدِيْثاً مُنْكَراً ، وَهُوَ اَحَبُّ إِلَيَّ مِنْ زُهَيْرِ بنِ مُحَمَّدٍ . (۱)

حافظ ابن حجر نے آپ کو ثقہ فقیہ قرار دیتے ہوئے لکھا کہ ہے کہ کبھی کبھار وہم ہوجاتا تھا: ’’ثقة فقيه ربماوهم‘‘۔(۲)

اس سے یہ بات پوری طرح واضح ہوجاتی ہے کہ یہ روایت قابل استدلال ہے اور بالخصوص شاہد بننے کی پوری صلاحیت رکھتی ہے۔

اس کے علاوہ یہی روایت اسی سند سے کتاب الثقات میں ابن حبان نے بھی ذکر کیا ہے :

على بن معبد بن شَدَّاد الْعَبْدي من أهل مصر يروي عَن اللَّيْث بن سعد وَعبيد الله بْن عَمْرو رَوَى عَنْهُ المصريون مُسْتَقِيم الحَدِيث حَدثنِي عبد الْملك بن مُحَمَّد بن سميع بصيداء ثَنَا الْمُزنِيّ ثَنَا عَليّ بن معبد عَن عبيد الله بن عَمْرو قَالَ الْاَعْمَش لأبي حنيفَة يَا نعْمَان مَا تَقول فِي كَذَا كَذَا قَالَ كَذَا وَكَذَا قَالَ من أَيْن قلت قَالَ اَنْت حَدَّثتنَا عَن فلَان بِكَذَا قَالَ الْاَعْمَش اَنْتُم يَا معشر الْفُقَهَاء الْاَطِبَّاء وَنحن الصيادلة ـ (۳)

اس روایت میں ابن حبان کے استاد عبدالملک تھوڑے غیر معروف ہیں؛لیکن اولاً تو ان کا ذکر خود ابن حبان نے کتاب الثقات میں کیا ہے،جس سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے نزدیک ان کے اپنے یہ استاد قابل اعتبار ہیں،دوسرے ان کا ذکر تاریخ دمشق وغیرہ میں بھی ہے،(۴)اور حافظ ذہبی نے بھی تاریخ الاسلام میں آپ کو محدث

(۱) سیر اعلام النبلاء:8/310۔

(۲) تقریب التہذیب:373۔

(۳) کتاب الثقات لابن حبان:8/468۔

(۴) مختصر تاریخ دمشق:15/218۔

اور فقیہ کے لقب سے یاد کیا ہے،(۱) اور اسی کے ساتھ اس کا بھی ذکر کیا ہے کہ آپ نے حدیث کی خاطر اسفار بھی کئے ہیں، اور آپ پر کوئی جرح بھی نہیں ہے، اور آپ کے ماقبل اور مابعد کے رواۃ ثقہ ہیں، جس سے اولاً تو ابن خزیمہ اور ابن حبان کی شرط پر یہ سند صحیح ثابت ہوتی ہے اور ویسے بھی یہ سند شاہد بننے کی پوری صلاحیت رکھتی ہے۔

یہی واقعہ الکامل فی ضعفاء الرجال میں سند صحیح سے مروی ہے :

حَدَّثَنَا اَحْمَدُ بْنُ مُحَمد بن عبيدة ، حَدَّثَنا المزني إسماعيل بن يَحْيى ، حَدَّثَنا علي بْن معبد عن عُبَيد الله بْن عَمْرو الجزري ، قَال : قَال الاَعْمَش يَا نعمان يعني اَبَا حنيفة ما تقول فِي كذا قَالَ كذا قَال : مَا تقول فِي كذا قَالَ كذا قَالَ من أين قلت قَالَ أنت حدثتني عن فلان عَنْهُ فَقَالَ الاَعْمَش يَا مَعْشَر الفقهاء أنتم الأطباء ونحن الصيادلة. (۲)

عبید اللہ بن عمرو کہتے ہیں کہ امام اعمش نے کہا اے نعمان (ابوحنیفہ) آپ فلاں فلاں مسئلہ میں کیا کہتے ہیں یعنی اپ کی رائے کیا ہے تو انھوں نے جواب دیا، اس پر امام اعمش نے سوال کیا آپ کی ان باتوں کی دلیل کیا ہے تو فرمایا وہی حدیث جو آپ نے فلاں کی سند سے بیان کی تھی اس پر امام اعمش نے کہا، اے گروہ فقہاء تم طبیب ہو اور ہم پنساری ہیں، اس کی سند پر نگاہ ڈالئے۔

احمد بن محمد بن عبیدۃ

محدثین کرام نے آپ کی ثقاہت کا اعتراف کیا ہے، حافظ ذہبی آپ کو امام، حافظ، علم حدیث کے لئے بکثرت سفر کرنے والے اور ثقہ قرار دیتے ہیں، (۳) مشہور محدث خطیب بغدادی نے بھی آپ کو ثقہ قرار دیا ہے۔(۴)

---

(۱) تاریخ الاسلام تبشار: 7/146۔

(۲) الکامل فی ضعفاء الرجال: 8/238۔

(۳) سیر اعلام النبلاء: 14/410۔

(۴) تاریخ بغداد: 5/259۔

امام مزنی

امام مزنی کا نام علماء کے حلقہ میں محتاج تعارف نہیں، آپ امام شافعیؒ کے خاص شاگرد اور ان کے علمی جانشیں تھے، آپ کی ثقاہت وفقاہت پر تقریباً تمام محدثین اور مورخین یک زبان ہیں، ابن ابی حاتم آپ کو صدوق لکھتے ہیں، ابن یونس آپ کو ثقہ کہتے ہیں، حافظ ذہبی کو امام، علامہ فقیہ الملت، زاہدوں کے سرتاج وغیرہ لکھتے ہیں، (۱) علاوہ ازیں امام مزنی کی سند سے حدیث کو ابن کثیر نے طبقات الشافعیین میں صحیح قرار دیا ہے، جس سے حافظ ابن کثیر کے نزدیک بھی امام مزنی کی ثقاہت واضح ہوتی ہے، علی بن معبد اور عبید اللہ بن عمرو کا تذکرہ ماقبل میں گزر چکا ہے۔

اس سند کے تمام روات ثقہ ہیں، سند متصل ہے، ہر ایک نے سماعت کی وضاحت کی ہے، اس کے بارے میں بلا کسی شک وشائبہ کے لکھا جاسکتا ہے، سندہ صحیح۔

ایک مزید سند ملاحظہ فرمائیں :

اَخْبَرَنَا الْحَسَنُ بْنُ عَلِيٍّ الْجَوْهَرِيُّ اَنَا مُحَمَّدُ بْنُ الْعَبَّاسِ الْخَزَّازُ نَا اَبُو بَكْرٍ عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ مُحَمَّدِ بْنِ زِيَادٍ النَّيْسَابُورِيُّ قَالَ سَمِعْتُ اَبَا إِبْرَاهِيمَ الْمُزَنِيَّ قَالَ اَنَا عَلِيُّ بْنُ مَعْبَدٍ نَا عُبَيْدُ اللّٰهِ بْنُ عَمْرٍو قَالَ كُنَّا عِنْدَ الْاَعْمَشِ وَهُوَ يَسْأَلُ اَبَا حَنِيفَةَ عَنْ مَسَائِلَ وَيُجِيبُهُ اَبُو حَنِيفَةَ فَيَقُولُ لَهُ الْاَعْمَشُ مِنْ اَيْنَ لَكَ هَذَا فَيَقُولُ اَنْتَ حَدَّثْتَنَا عَنْ إِبْرَاهِيمَ بِكَذَا وَحَدَّثْتَنَا عَنِ الشَّعْبِيِّ بِكَذَا قَالَ فَكَانَ الْاَعْمَشُ عِنْدَ ذَلِكَ يَقُولُ : يَامَعْشَرَ الْفُقَهَاءِ اَنْتُمُ الْاَطِبَّاءُ وَنَحْنُ الصَّيَادِلَةُ۔ (۲)

حسن بن علی جوہری

آپ خطیب کے استاذ ہیں، خطیب آپ کے بارے میں لکھتے ہیں :

---

(۱) سیر اعلام النبلاء: 12/495۔ (۲) نصیحۃ اہل الحدیث: 45۔

كتبنا عنه ، وكان ثقة أمينا كثير السماع ۔ (۱)

حافظ ذہبی آپ کو شیخ، امام، محدث، صدوق اور مسند الآفاق کے گراں قدر القاب سے یاد کرتے ہیں :

الجَوْهَرِيُّ اَبُو مُحَمَّدٍ الحَسَنُ بنُ عَلِيّ بنِ مُحَمَّدٍ الشَّيْخُ ، الإِمَامُ ، المُحَدِّثُ ، الصَّدُوْقُ ، مُسْنِدُ الآفَاقِ ، اَبُو مُحَمَّدٍ الحَسَنُ بنُ عَلِيّ بنِ مُحَمَّدِ بنِ الحَسَنِ الشيرَازِيُّ ثُمَّ البَغْدَادِيُّ ، الجَوْهَرِيُّ ، المُقَنَّعِي ۔ (۲)

محمد بن عباس خـزار

آپ پر مشہور محدث ازہری نے ایک ہلکی سی جرح یہ ہے کہ آپ بسا اوقات اصل نسخہ نہ ہونے کی بناء دوسرے نسخہ جس پر آپ کا سماع نہیں ہوتا تھا، اس سے روایت کرتے تھے، اور ابن ابی فوارس نے بھی آپ پر روایت کے شرائط ومعیار میں تسامح کی جرح کی ہے، مگر محدثین عظام کے جس جم غفیر نے آپ کو ثقہ قرار دیا ہے، اس کے بالمقابل یہ ہلکی جرح کوئی معنی نہیں رکھتی؛ چنانچہ تسامح کا جرح کرنے والے خود ازہری نے بھی آپ کو ثقہ قرار دیا ہے، اس کے علاوہ مشہور محدث برقانی نے آپ کو ثقہ، ثبت اور حجت کہا ہے، مشہور محدث عتیقی نے آپ کو ثقہ بیدار مغز لکھا ہے، خطیب نے آپ کو ثقہ اور بکثرت روایت کرنے والے لکھا ہے، ابن ماکولا نے آپ کو ثقہ اور مامون قرار دیا ہے، ابن جوزی نے آپ کو ثقہ اور دین دار بتایا ہے، رشید عطار نے آپ کو ثقہ اور مامون قرار دیا ہے، حافظ ذہبی نے آپ کو امام، محدث، ثقہ اور مسند قرار دیا ہے، ابن کثیر نے ثقہ، دین دار، بیدار مغز اور صاحب مروت لکھا ہے، ابن ناصر الدین دمشقی نے آپ کو ثقہ اور بکثرت روایت کرنے والا قرار دیا ہے۔(۳)

ابو بکر عبداللہ بن محمد زیاد نیشاپوری

آپ کی عظمت شان اور فقہ وحدیث کی جامعیت پر محدثین اور مورخین کا اتفاق ہے، سب کو نہ بیان کر کے محض امام دار قطنی کا بیان ہم نقل کر دیتے ہیں :

---

(۱) تاریخ بغداد:8/397۔

(۲) سیر اعلام النبلاء:18/68۔

(۳) الدلیل المغنی لشیوخ الامام أبی الحسن الدار قطنی:401۔

سلمی کہتے ہیں کہ ہم نے دارقطنی سے ابوبکر نیشاپوری کے بارے پوچھا تو دارقطنی نے فرمایا: اپنے اساتذہ میں ان کے جیسا ہم نے کسی کو نہیں پایا، اور نہ ہی ان سے زیادہ اسانید اور متون کا حافظ کسی کو دیکھا اور نہ ہی ان سے زیادہ کسی کو فقیہ پایا، مزنی اور ربیع کی صحبت آپ نے اُٹھائی تھی اور متون میں رواۃ کے زیادہ کئے گئے الفاظ سے آپ بخوبی واقف تھے :

قال السُّلَمِيُّ : سألت الدَّارَ قُطْنِيّ عن أبي بكر النيسابوري ، فقال : لم نر مثله في مشايخنا ، لم نر أحفظ منه للأسانيد والمتون ، وكان أفقه المشايخ ، جالس المزني والربيع ، وكان يعرف زيادات الألفاظ في المتون ـ (۱)

اس سے آگے کی سند میں امام مزنی، علی بن معبد بن شداد اور عبید اللہ بن عمرو ہیں جن کی ثقاہت کی وضاحت ماقبل میں کر دی گئی ہے، اور یہ سند بھی صحیح اور درست ہے اور اس پر بھی کسی زاویے سے کوئی گرفت نہیں ہے۔

امام ابو یوسف اور امام اعمش کا واقعہ

امام اعمش اور امام ابوحنیفہ کا یہ واقعہ تو آپ نے پڑھ لیا، اسی طرح کا ایک واقعہ امام اعمش اور امام ابو یوسف کے درمیان پیش آیا تھا، اس واقعہ کو کئی حضرات جیسے خطیب بغدادی، ابن عبدالبر، صیمری وغیرہ نے نقل کیا ہے؛ چنانچہ خطیب اس تعلق سے لکھتے ہیں :

أُخْبُرْنَا القَاضِي ابو مُحَمَّد قَالَ ثَنَا ابو بكر الدَّامغَانِي قَالَ ثَنَا ابو جَعْفَر الطَّحَاوِيّ قَالَ ثَنَا ابْن ابي عمرَان قَالَ ثَنَا بشر بن الْوَلِيد قَالَ سَمِعت ابا يُوسُف يَقُول سَألَنِي الْاَعْمَش عَن مَسْأَلَة فأجبته فِيهَا فَقَالَ لي من اَيْن قلت هَذَا فَقلت لحديثك الَّذِي حدثتناه انت ثمَّ ذكرت لَهُ الحَدِيث فَقَالَ لي يَا يَعْقُوب اني لأحفظ هَذَا الحَدِيث قبل ان يجْتَمع ابواك فَمَا عرفت تَأْوِيله حَتَّى الْآن ـ (۲)

(۱) الدلیل المغنی لشیوخ الامام أبی الحسن الدارقطنی:254۔ (۲) تاریخ بغداد:14/249۔

بشر بن الولید ابو یوسف سے نقل کرتے ہیں کہ مجھ سے اعمش نے کسی مسئلہ کے تعلق سے پوچھا تو میں نے جواب دیا تو انھوں نے مجھ سے کہا اس کی دلیل کیا ہے تو میں نے کہا کہ اس مسئلہ کی دلیل وہ حدیث ہے جو آپ نے ہم سے بیان کیا تھا پھر میں نے حدیث ذکر کی تو فرمایا اے یعقوب، یہ حدیث مجھ کو تب سے یاد ہے جب تمہارے والدین کی شادی بھی نہیں ہوئی تھی؛ لیکن اس کی تفسیر آج معلوم ہوئی ہے۔

اس حدیث کی سند لاباس بہ ہے؛ کیوں کہ اس میں قاضی ابومحمد اور ابوبکر الدامغانی کی توثیق کسی نے واضح طور پر نہیں کی؛ لیکن ان کے علم وفضل کی عمومی طور پر تعریف کی گئی ہے، اسی واقعہ کو اخبار ابی حنیفۃ واصحابہ میں صیمری نے بھی روایت کیا ہے؛ چنانچہ ملاحظہ ہو :

أَخْبَرَنَا القَاضِي ابو مُحَمَّد قَالَ ثَنَا ابوبكر الدَّامغَانِي قَالَ ثَنَا ابو جَعْفَر الطَّحَاوِيّ قَالَ ثَنَا ابْن ابي عمرَان قَالَ ثَنَا بشر بن الْوَلِيد قَالَ سَمِعت ابا يُوسُف يَقُول سَأَلَنِي الْاَعْمَش عَن مَسْأَلَة فأجبته فِيهَا فَقَالَ لي من أَيْن قلت هَذَا فَقلت لحديثك الَّذِي حدثتناه انت ثمَّ ذكرت لَهُ الحَدِيث فَقَالَ لي يَا يَعْقُوب اني لأحفظ هَذَا الحَدِيث قبل ان يجْتَمع ابواك فَمَا عرفت تَأْوِيله حَتَّى الْآن ۔ (۱)

اس کی بھی سند لاباس بہ ہے، ابن عبدالبر جامع بیان العلم وفضلہ میں لکھتے ہیں :

بِشْرُ بْنُ الْوَلِيدِ ، عَنْ أَبِي يُوسُفَ قَالَ : سَأَلَنِي الْاَعْمَشُ عَنْ مَسْأَلَةٍ ، وَأَنَا وَهُوَ لَا غَيْرَ ، فَأَجَبْتُهُ ، فَقَالَ لِي : مِنْ أَيْنَ قُلْتَ هَذَا يَا يَعْقُوبُ ؟ فَقُلْتُ : بِالْحَدِيثِ الَّذِي حَدَّثْتَنِي أَنْتَ ، ثُمَّ حَدَّثْتُهُ ، فَقَالَ لِي: يَا يَعْقُوبُ إِنِّي لَأَحْفَظُ هَذَا الْحَدِيثَ مِنْ قَبْلِ أَنْ يَجْتَمِعَ أَبَوَاكَ مَا عَرَفْتُ تَأْوِيلَهُ إِلَّا الْآنَ ۔ (۲)

اس کو بعد کے مورخین مثلا حافظ ذہبی، ابن خلکان اور صفدی وغیرہ نے بھی بیان کیا ہے، جس سے مزید اس بات کی وضاحت ہوتی ہے کہ فقہاء کرام کو محدثین پر کس باب میں خاص امتیاز حاصل تھا۔

---

(۱) اخبار ابی حنیفۃ واصحابہ:102۔ (۲) جامع بیان العلم وفضلہ:2/1029۔

حیرت کی بات یہ ہے کہ قاضی ابو یوسف اور امام اعمش کے درمیان واقعہ میں تمام مورخین نے یہ الفاظ نقل کئے ہیں :

إِنِّي لَاَحْفَظُ هَذَا الْحَدِيثَ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَجْتَمِعَ اَبَوَاكَ مَا عَرَفْتُ تَأْوِيلَهُ إِلَّا الْآنَ۔

مگر مولانا ارشاد الحق اثری صاحب کو پتہ نہیں اس عبارت کے پڑھنے میں کیا غلط فہمی پیش آئی کہ وہ اس عبارت ''لأحفظ'' کو ''لا احفظ'' پڑھ گئے اور اسی کی بنیاد پر یہ بھی لکھ دیا :

> اسی طرح اسی نوعیت کا ایک واقعہ امام اعمش اور قاضی ابو یوسف کے مابین بیان کیا جاتا ہے جسے علامہ ابن البر نے الجامع :2/ 131، 132 میں، خطیب نے تاریخ بغداد: 14/ 446 میں اور قاضی الصیمر ی نے مناقب: 96 میں ذکر کیا ہے قاضی ابو یوسف نے جب یہ کہا کہ یہ جواب آپ ہی کی بیان کردہ حدیث سے ماخوذ ہے تو انھوں نے فرمایا: ''یا یعقوب انی لا احفظ ھذا الحدیث من قبل'' اے یعقوب مجھے اس سے پہلے یہ حدیث یاد نہیں تھی، یہ قصہ سنداً درست ہے؛ کیوں کہ حدیث کا یاد نہ رہنا اور بھول جانا ایک بشری تقاضا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ مولانا ارشاد الحق اثری نے جن کتابوں کا بھی حوالہ دیا ہے، ان تمام کتابوں میں ''لأحفظ'' ہے: ''لا احفظ'' کسی بھی کتاب میں نہیں ہے اور اس کی بنیاد پر مولانا ارشاد الحق اثری نے بھول جانے اور یاد رہنے کی جو بات کہی ہے، وہ بھی غلط ہے؛ کیوں کہ مسئلہ بھول جانے کا نہیں تھا، مسئلہ اس حدیث کے مفہوم اور اس سے مستنبط احکام کو جاننے کا تھا، یہی وجہ تھی کہ صاحب واقعہ امام اعمش نے بڑی فراخ دلی کے ساتھ اس کا اعتراف کیا کہ میں اس حدیث کو تب سے جانتا ہوں جب تمہارے والدین کی شادی بھی نہیں ہوئی تھی مگر اس کا صحیح مفہوم اور مطلب آج ہی سمجھ میں آیا ہے۔

مولانا ارشاد الحق اثری صاحب نے مزید یہ فرمایا ہے: خطیب بغدادی نے الفقیہ والمتفقہ :2/ 84 میں امام ابوحنیفہ کے اس واقعہ کو احمد بن عطیہ الحمانی کے علاوہ ایک دوسری سند سے بھی ذکر کیا ہے جس کے راوی ثقہ ہیں مگر اس میں بھی وہ رنگ آمیزی نہیں جو علامہ ملاعلی القاری کی المناقب میں پائی جاتی ہے۔

پتہ نہیں رنگ آمیزی سے مولانا ارشاد الحق اثری کی مراد کیا ہے، حقیقت یہ ہے کہ دونوں روایتوں میں کوئی فرق نہیں ہے، ہم دونوں روایتوں کو آپ کے سامنے رکھ دیتے ہیں یہ روایت اخبار ابی حنیفہ صیمری کی ہے :

أخبرنَا عبد الله بن مُحَمَّد قَالَ ثَنَا مكرم قَالَ ثَنَا اَحمد بن عَطِيَّة قَالَ ثَنَا عَليّ بن معبد قَالَ ثَنَا عبيد الله بن عمر قَالَ كُنَّا عِنْد الْاَعْمَش وَهُوَ يسْأَل اَبَا حنيفَة عَن مسَائِل ويجيبه ابو حنيفَة فَيَقُول لَهُ الْاَعْمَش من اَيْن لَك هَذَا فَيَقُول انت حَدَّثتنَا عَن إِبْرَاهِيم بِكَذَا وحدثتنا عَن الشّعبِيّ بِكَذَا قَالَ فَكَانَ الْاَعْمَش عِنْد ذَلِك يَقُول يَا معشر الْفُقَهَاء اَنْتُم الْاَطِبَّاء وَنحن الصيادلة ۔ (۱)

اور یہ روایت خطیب بغدادی کی الفقیہ والمتفقہ کی ہے :

وأنا الْحَسَنُ بْنُ عَلِيّ الْجَوْهَرِيُّ أنا مُحَمَّدُ بْنُ الْعَبَّاسِ الْخَزَّازُ نا اَبُو بَكْرٍ عَبْدُ اللهِ بْنُ مُحَمَّدِ بْنِ زِيَادٍ النَّيْسَابُورِيُّ قَالَ : سَمِعْتُ اَبَا إِبْرَاهِيمَ الْمُزَنِيَّ قَالَا : نا عَلِيُّ بْنُ مَعْبَدٍ نا عُبَيْدُ اللهِ بْنُ عَمْرٍو قَالَ [ص:164] : كُنَّا عِنْدَ الْاَعْمَشِ وَهُوَ يَسْأَلُ اَبَا حَنِيفَةَ عَنْ مَسَائِلَ وَيُجِيبُهُ اَبُو حَنِيفَةَ فَيَقُولُ لَهُ الْاَعْمَشُ : مِنْ اَيْنَ لَكَ هَذَا ؟ فَيَقُولُ : اَنْتَ حَدَّثْتَنَا عَنْ إِبْرَاهِيمَ بِكَذَا وَحَدَّثْتَنَا عَنِ الشَّعْبِيِّ بِكَذَا قَالَ : فَكَانَ الْاَعْمَشُ عِنْدَ ذَلِكَ يَقُولُ : يَا مَعْشَرَ الْفُقَهَاءِ اَنْتُمُ الْأَطِبَّاءُ وَنَحْنُ الصَّيَادِلَةُ ۔ (۲)

اسی طرح مولانا ارشاد الحق اثری مزید فرماتے ہیں :

لیکن ان واقعات سے یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ محدثین فقیہ نہیں ہوتے تھے وہ محض دوا فروش ہوتے تھے اور پھر اسی بنا پر طبقات کی تقسیم قطعی طور پر غلط اور حقیقت واقعی سے بے خبری کی دلیل ہے۔

---

(۱) اخبار ابی حنیفۃ واصحابہ:1/27۔ (۲) الفقیہ والمتفقہ :2/163۔

سوال یہ ہے کہ یہ تقسیم کون کررہاہے، یہ توخود امام اعمش کررہے ہیں، وہ گروہ فقہاء کو اطباء بتارہے ہیں اورگروہ محدثین کو پنساری بتارہے ہیں، یہ بات کسی حنفی نے تونہیں کی ہے، یہ توخود محدثین کی صف کا ایک نامور آدمی کہہ رہاہے، اوراس سے کہہ رہاہے،جس سے اس کوایک طویل عرصہ تک گرانی رہی ہے،جیسا کہ ماقبل میں مذکورہے۔

اس سے انکارنہیں کیاجاسکتاہےاورنہ کوئی سلیم الفطرت انسان اس کاانکارکرے گا، کہ محدثین میں سے بھی بہت سارے حضرات فقیہ بھی واقع ہوئے ہیں اورفقہاء میں سے بہت سارے حضرات حدیث کےفن سے بخوبی آشنا تھے؛ لیکن اس کی بنیاد پر یہ کہنا کہ فقہا اورمحدثین کی تقسیم اورزمرہ بندی غلط ہے، یہ بالبداہت غلط بات ہے،جس کی کوئی بھی سلیم الفطرت انسان تائیدنہیں کرے گا، جیسے ایک ڈاکٹرانجینئر ہوسکتاہے،ایک انجینئر ڈاکٹرہوسکتاہے؛لیکن اس کا یہ مطلب کہاں سے ہوگیا کہ انجینئراورڈاکٹرکی طبقاتی تقسیم غلط ہے۔

ایک نکتہ کی بات

بعض حضرات کو پتہ نہیں کیوں جہاں محدثین کوصیادلہ (پنساری کہاجاتا ہے) توانھیں تاؤ آنے لگتاہے اورتیوریاں چڑھنے لگتے ہیں اورچہرے کازاویہ بننے بگڑنے لگتاہے، یہ حیرت اس وقت مزید ہوجاتی ہے جب پتہ چلتاہے کہ محدثین کرام کوخوداس بات سے کوئی گرانی نہیں تھی؛ بلکہ وہ اس کوبخوشی تسلیم کیاکرتے تھے۔

ماقبل میں آپ نے دیکھا کہ امام اعمش خودہی کہہ رہے ہیں کہ گروہ فقہاءتم طبیب ہواورہم پنساری (کیمسٹ) ہیں،اب اس سلسلے میں کچھ مزید نقول ذکر کئے جاتے ہیں،امام شافعی کامقام ومرتبہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے،امام شافعی کاعلم فقہ میں بطورخاص جومقام تھاوہ بہت بلند تھا،انھوں نے ایک مرتبہ اہل حدیثوں سے مخاطب ہوکرکہا کہ تم لوگ پنساری ہواورہم ڈاکٹرہیں :

قَالَ الرَّبِيْعُ : سَمِعْتُ الشَّافِعِيَّ قَالَ لِبَعْضِ اَصْحَابِ الحَدِيْثِ :
اَنْتُم الصَّيَادِلَةُ ، وَنَحْنُ الاَطِبَّاءُ ۔ (۱)

ربیع کہتے ہیں کہ میں نے امام شافعی سے سنا کہ وہ بعض اہل حدیث سے کہہ رہے تھے،تم پنساری ہو اورہم اطباءہیں،یہی بات بعدمیں ایک مشہورمحدث سلیمان بن زبر سے امام طحاوی نے فرمایاتھا :

(۱) سیر أعلام النبلاء ط الرسالۃ:10/ 23۔

قال أبو سليمان بن زبر : كان الطحاوي قد نظر في أشياء كثيرة من تصنيفي ، وباتت عنده ، وتصفحها ، فأعجبته ، وقال لي : يا أبا سليمان ، أنتم الصيادلة ونحن الأطباء ۔ (۱)

سلیمان بن زبر کہتے ہیں کہ طحاوی نے میری تصنیف کا بغور مطالعہ کیا تو ان کو میری تصنیف پسند آئی اور پھر مجھ سے کہا اے ابوسلیمان! تم پنساری ہو اور ہم ڈاکٹر ہیں۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ امام اعمش نے امام ابوحنیفہ کی فقاہت کا کھلے دل سے اعتراف کیا ہے اور محدثین اور فقہاء کی تقسیم اور استنباط احکام میں فقہاء کے امتیاز کو بھی صاف لفظوں میں قبول کیا ہے، یہ ان کے بڑے دل اور بڑے ظرف کی بات تھی، علاوہ ازیں چاہے امام اعمش ہو، امام شافعی ہوں، یا پھر امام طحاوی ہوں، سب نے فقہاء اور محدثین کی طبقاتی تقسیم اور فقہاء کے امتیاز کو تسلیم کیا ہے، دلچسپ بات یہ ہے کہ ماضی میں کبھی کسی محدث کو اس بات کی شکایت نہیں ہوئی کہ ان کو صیادلہ کہا جارہا ہے، مگر موجودہ دور میں ان محدثین کے نام لیوا ہی اس بات کو کسی صورت قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہیں کہ حدیث اور فقہ کی تقسیم کی طرح محدثین اور فقہاء کی تقسیم موجود ہے اور رہے گی، حقیقت تو یہ ہے کہ محدثین کے نقش قدم پر چلنے کا دعویٰ کرنے والوں کو چاہئے کہ وہ محدثین کی طرح ہی اس بات کو کھلے دل سے تسلیم کریں کہ استنباط احکام فقہاء کا امتیاز اور خاصہ رہا ہے۔

• • •

(۱) تاریخ دمشق: 22/ 260، تذکرۃ الحفاظ: 3/ 135، سیر اعلام النبلاء: 16/ 441۔

حضرت مولانا نور عالم خلیل امینیؒ
ایک مثالی استاذ اور مقبول ادیب وقلم کار

خالد سیف اللہ رحمانی

کھلا ہوا رنگ، خوبصورت خد وخال، کھڑی ناک، اونچی پیشانی، متوسط جسامت اور متوسط قد وقامت، نفیس سفید کرتا پائجامہ، اس کے اوپر شیروانی جو اکثر بادامی رنگ کی ہوتی، اسی کپڑے کی ٹوپی، خوبصورت سا چشمہ، غرض کہ ہر چیز سے خوش سلیقگی اور خوش ذوقی نمایاں، لکھتے بائیں ہاتھ سے، تحریر بھی بڑی خوبصورت اور اتنی صاف کہ ایک ایک حرف بے تکلف سمجھ میں آجائے، خصائل وشمائل کے اس مجموعہ کا نام ہے: حضرت مولانا نور عالم خلیل امینی رحمۃ اللہ علیہ۔

والد ماجد کا اسم گرامی حافظ خلیل احمد تھا، اسی نسبت مولانا نور عالم خلیل کے نام سے پہچانے جاتے تھے، صاحبزادہ کی نسبت سے ابواسامہ کی کنیت اختیار کرتے تھے، اور بعض تحریریں اسی نام سے لکھتے تھے، یوں تو انھوں نے مختلف مدارس سے کسب فیض کیا ہے؛ لیکن فراغت مدرسہ امینیہ دہلی سے ہوئی، اور اس طرح امینی ان کے نام کا جز ولازم بن گیا۔

وہ ۱۸/دسمبر ۱۹۵۲ء مطابق یکم ربیع الثانی ۱۳۷۲ھ کو پیدا ہوئے، بہار کے ضلع سیتامڑھی کے علم خیز قریہ ''رائے پور'' میں پیدا ہوئے، ان کا نانیہال ہر پور بیشی ضلع مظفر پور تھا، بہار کے بڑے عالم حضرت مولانا بدر الحسن قاسمی (حال مقیم: کویت) کا تعلق بھی اسی گاؤں سے ہے۔

مولانا کو اپنی ابتدائی زندگی میں ہی یتیمی کا داغ سہنا پڑا، اور زندگی کے سرد وگرم راستہ پر آبلہ پائی کرنی پڑی۔

مکتب کی تعلیم گاؤں میں حاصل کی، کچھ بڑے ہوئے تو مدرسہ امدادیہ دربھنگہ میں داخلہ لیا، اور درجہ

ششم اردو تک تعلیم حاصل کی، ۱۹۶۴ء میں دارالعلوم مئو میں داخل ہوئے، یہیں سے عربی تعلیم کا آغاز ہوا، ۱۹۶۷ء، ۱۳۸۷ھ میں دارالعلوم دیوبند کا رُخ کیا، اور تعلیم کا آخری مرحلہ ۱۹۷۰ء میں مدرسہ امینیہ دہلی سے مکمل کیا، مولانا کو اپنے عہد کے اکابر اہل علم سے استفادہ کا موقع ملا، مدرسہ امدادیہ میں حضرت مولانا محمد اویس رائے پوری سے، جن سے اس حقیر کو بھی تلمذ کا شرف حاصل ہے، دارالعلوم مئو میں مولانا ریاست صاحبؒ، مولانا شیخ محمد مئویؒ، مولانا عبدالحق اعظمیؒ وغیرہ سے، دارالعلوم دیوبند میں مولانا وحیدالزماں کیرانویؒ، مولانا محمد حسین بہاریؒ، مولانا معراج الحق صاحبؒ، مولانا نصیر احمد خان صاحبؒ، مولانا فخرالحسن مرادآبادیؒ، مولانا شریف الحسن دیوبندیؒ وغیرہ سے، اور مدرسہ امینیہ میں مشہور مصنف حضرت مولانا سید محمد میاں دیوبندیؒ سے، انھوں نے ایسے اساتذہ سے کسب فیض کیا، جو آسمان علم کے آفتاب وماہتاب تھے؛ لیکن ان کو زیادہ قربت حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب دیوبندیؒ اور حضرت مولانا وحیدالزماں صاحب کیرانویؒ سے رہی، پھر اخیر میں فکری و تصنیفی تربیت، اور عربی زبان وادب میں استفادہ کا موقع حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ سے حاصل ہوا، وہ ان تمام بزرگوں کے بے حد قدرداں اور احسان شناس تھے، استاذ الاساتذہ مولانا کیرانویؒ پر تو ان کی مستقل کتاب ''وہ کوہ کن کی بات'' کی نام سے آچکی ہے، حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ اور حضرت مولانا محمد میاں صاحبؒ سے عقیدت ومحبت اور والہانہ تعلق کو ان کی کتاب ''پس مرگ زندہ'' میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے، ویسے وہ اپنے تمام ہی اساتذہ کا نام بڑی عظمت کے ساتھ لیتے تھے، اور منھ بھر بھر کر ان کے محاسن کا ذکر کیا کرتے تھے۔

اگرچہ انھوں نے اپنی تدریس کا کچھ حصہ جنوبی ہند کے مشہور شہر اورنگ آباد کی دینی درسگاہ مدرسہ کاشف العلوم میں بھی گزارا، جو دعوت وتبلیغ کا مرکز اور ندوہ کی بڑی شاخوں میں سے ایک ہے؛ لیکن ان کی تدریس کا زیادہ عرصہ ہندوستان کی دوسب سے بڑی اور ممتاز دینی جامعات میں گزرا، دس سال دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ اور ۳۹؍سال دارالعلوم دیوبند میں، ندوہ میں ان کی تقرری حضرت مولانا سید محمد میاںؒ کی کوششوں سے ہوئی، اور دیوبند میں حضرت مولانا وحیدالزماں کیرانویؒ کی وساطت سے۔

اللہ تعالیٰ نے ان کو ترجمہ وتالیف کی نمایاں صلاحیت عطا فرمائی تھی، اُردو زبان میں ان کی کتابیں ''وہ کوہ کن کی بات'' اور شخصیات پر تحریروں کا مجموعہ ''پس مرگ زندہ'' اُردو کی بہت مقبول کتابوں میں شامل ہے، سنا ہے کہ شخصیات سے متعلق مضامین کا ایک اور مجموعہ ''رفتگان نارفتہ'' کے نام سے بھی زیر طبع ہے، ان کتابوں

کے نام کو دیکھئے کہ اگر چہ وہ فارسی زدہ ہیں اورعوام کو تو ان کا ترجمہ کر کے سمجھانا پڑے گا؛لیکن پھر بھی ان ناموں میں کس بلا کا حسن ہے،عظمتِ صحابہ پر بھی ان کی ایک کتاب خاصہ کی چیز ہے،ان کی غیرتِ ایمانی کی ایک دلیل وہ تحریریں ہیں جو انھوں نے بیت المقدس اور فلسطین کے مسئلہ پر لکھی ہیں، میرے محدود علم کے مطابق ہندوستان میں مدرسہ کی دنیا سے تعلق رکھنے والے کسی صاحبِ قلم نے اس حادثہ کا اتنا ماتم نہیں کیا، جتنا مولانا امینی صاحبؒ نے کیا،اب تو امت کے ایک بڑے طبقہ نے اس مسئلہ کو اپنی فہرست سے ہی نکال دیا ہے،حدیث کے مطابق شہر قدس میں ہی میدان حشر قائم ہوگا، ان شاء اللہ وہاں ضرور حشر کی زمین اس مردِ خدا کے جذبۂ ایمانی اور حمیت اسلامی کی شہادت دے گی، اس کے علاوہ انھوں نے کم وبیش ۲۵ ر کتابوں کو اردو سے عربی میں منتقل کیا، جس میں حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ، حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ، حضرت مولانا شرف علی تھانویؒ، حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ اور حضرت مولانا محمد تقی عثمانی کے مضامین وکتب شامل ہیں۔

ان کی تصنیفات میں ''مفتاح العربیۃ''(۲ ر حصہ)ہمیشہ یادرکھی جائے گی، جوانھوں نے عربی زبان کی تعلیم کی ابتدائی ریڈر کے طور پر لکھی ہے، اور ایک اسی کتاب پر موقوف نہیں، ان کی متعدد کتابیں اردو اور عربی میں طلبہ کو سامنے رکھ کر لکھی گئی ہیں۔

مولانا اپنے مزاج کے اعتبار سے عوامی مقرر نہیں تھے؛لیکن طلبہ سے خطاب کرتے تھے، جس میں تدریسی وتربیتی رنگ نمایاں ہوتا تھا، اس سلسلہ میں ان کی یادگار تالیف ''حرف شیریں'' دیکھی جاسکتی ہے، اس کتاب کے نام سے اس کے مضمون کی طرف ذہن منتقل نہیں ہوتا؛لیکن یہ مولانا کے ان محاضرات کا مجموعہ ہے، جو آپ نے طلبہ کے سامنے دیئے ہیں، اس میں انشاء پردازی کا طریقہ بتلایا گیا ہے، تفصیل سے خط کی اہمیت، املاء کے اسلوب اور تحریری رموز واوقاف پر روشنی ڈالی گئی ہے، یہ کتاب اس لائق ہے کہ مدارس کی منتہی جماعتوں کے ہر طالب علم کو پڑھنا چاہئے، اس کتاب میں صرف معلومات کا اجتماع نہیں ہے؛ بلکہ مصنف کا تجربہ بھی شامل ہے؛ کیوں کہ وہ اعلیٰ درجہ کے خطاط اور املا کے ماہر بھی تھے، میں نے جن علماء کو دیکھا کسی کو رموزِ تحریر کا ان سے بڑھ کر اہتمام کرتے نہیں دیکھا۔

مسلسل بیماری اور تدریسی مشغولیات کے باوجود وہ مسلسل لکھتے اور خوب لکھتے، ان کی تحریریں عربی واُردو مجلّات میں کثرت سے شائع ہوتی تھیں، اور اہل علم شوق ومحبت کے ساتھ انہیں پڑھا کرتے تھے۔

مولانا کی مجلس بہت باغ و بہار ہوتی تھی، وہ بہت ہی لطیف اور خوبصورت طنز کیا کرتے تھے، اور طبع زاد الفاظ اور خود تراشیدہ ترکیبیں استعمال کرتے تھے، اپنے شاگردوں کو ڈانٹ ڈپٹ کرنے میں بعض دفعہ یہ طنز ومزاح حد اعتدال سے بھی گزر جاتا تھا؛ لیکن ان کی بے پایاں شفقت اور طلبہ کے ساتھ اولاد جیسے سلوک کی وجہ سے ان کے شاگرد اس کڑواہٹ میں بھی حلاوت محسوس کیا کرتے تھے، مگر یہ اپنے بے تکلف شاگردوں کے سامنے ہی ہوا کرتا تھا، ایک بار ان کے دولت خانہ میں ان کے ساتھ بیٹھا تھا، اپنے کسی شاگرد کی نالائقی کا ذکر کرتے ہوئے ان کی زبان پر کوئی ہلکا لفظ آ گیا، شاید ان کو خیال نہیں رہا؛ چنانچہ وہ جھینپ گئے، میں نے موقع کی رعایت کرتے ہوئے گفتگو کا رُخ موڑ دیا، گویا ان کی بات ہی نہ سنی ہو۔

ان کو دارالعلوم دیوبند اور اس کے اکابر سے بے حد عقیدت ومحبت تھی، میں نے ایک سے زیادہ دفعہ دیکھا کہ دارالعلوم کا ذکر کرتے ہوئے ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے، ایک بار کہنے لگے: میرا یقین ہے کہ حرمین شریفین کے بعد یہ سب سے مبارک سرزمین ہے، ایسی باتیں اگلی نسلوں کے لئے مبالغہ کا راستہ کھول دیتی ہیں؛ اس لئے میں نے ضروری سمجھا کہ محبت واحترام کے ساتھ اس پر ٹوکا جائے، میں نے عرض کیا: حرمین شریفین اور اس کے بعد مسجد اقصیٰ، اور مسجد اقصیٰ کے بعد بعض اور مقامات کا تقدس منصوص ہے، جو چیزیں شخصی محبت وعقیدت پر مبنی ہوں ان کو نصوص شرعی کے مقابل میں نہیں رکھا جا سکتا، ہاں اگر علمی دینی خدمات کے اعتبار سے دیکھا جائے تو موجودہ دور میں دارالعلوم دیوبند شاید حرمین شریفین کے علمی مراکز سے بھی لائق فائق ہو؛ مگر علمی مراکز ہر دور میں بدلتے رہے ہیں؛ اس لئے اگرچہ دارالعلوم کی نسبت میرے لئے بھی تمغۂ سعادت اور وجہ عزت ہے؛ لیکن آپ جیسوں کو الفاظ کے استعمال میں احتیاط برتنی چاہئے؛ کیوں کہ آپ دارالعلوم دیوبند کے ایک مقبول استاذ ہیں، انھوں نے میری بات کا برا نہیں مانا۔

مولانا کی یہ بات مجھے بہت بھاتی ہے ہے کہ انھوں نے اپنے بزرگوں اور محسنوں کے سلسلہ میں اپنی زبان وقلم کی بھی حفاظت کی، اور اپنے محسنوں کا اعتراف کرنے میں کسی بخل سے کام نہیں لیا، حضرت مولانا وحید الزماں کیرانویؒ ان کے استاذ بھی تھے، ان کو دارالعلوم دیوبند میں مدرس مقرر کرنے میں بھی ان کا اہم کردار تھا؛ لیکن مولانا کیرانویؒ کی اخیر زندگی میں دارالعلوم کی اس وقت کی انتظامیہ سے ان کا شدید اختلاف ہو گیا تھا، جب مولانا کا انتقال ہوا اس وقت بھی پوری شدت کے ساتھ یہ اختلاف موجود تھا، اور مولانا امینی دارالعلوم میں مدرس تھے، ایسا خیال ہو سکتا تھا کہ اس وقت مولانا کی شخصیت پر کچھ لکھنا میرے لئے نقصان دہ ہو سکتا ہے؛ لیکن

مولانا نے اس کی پرواہ کئے بغیر ''وہ کوہ کن کی بات'' کے نام سے مولانا کیرانویؒ کی البیلی سوانح لکھی، جوصرف ان کی صلاحیتوں ہی کی عکاس نہیں ہے؛ بلکہ طلبہ کی تربیت کا ایک صحیفہ بھی ہے، قابل تعریف بات یہ ہے کہ انھوں نے ایسی خوش اسلوبی سے مولانا کی شخصیت پر قلم اٹھایا ہے کہ اس کو اختلاف کے سایہ سے بھی دور رکھا، یہ یقیناً ان کی اخلاقی بلندی اور مہارت کا ثبوت ہے۔

جس انتظامیہ نے انہیں دارالعلوم میں خدمت کا موقع دیا، اس کا سابق مہتمم حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ سے شدید اختلاف تھا، اللہ کا شکر ہے کہ بعد میں دونوں بزرگوں کے اَخلاف نے وسیع القلبی کا ثبوت دیتے ہوئے اس اختلاف کو ختم کیا، اور اگلی نسل کو اس سے نجات عطا فرمائی، بہرحال اسی زمانۂ اختلاف میں مولانا امینیؒ نے قاری طیب صاحبؒ کی بعض کتابوں کو عربی زبان کا جامہ پہنایا اور ''الشیخ المقری محمد طیبؒ'' کے نام سے ان کا تذکرہ بھی مرتب کیا، قاری صاحبؒ کی وفات پر انھوں نے جو مضمون تحریر کیا ہے، وہ ''پس مرگ زندہ'' میں شامل ہے، اس کا یہ اقتباس پڑھئے، کس قدر محبت میں ڈوبا ہوا اور تعظیم وتکریم کے جذبہ سے نہایا ہوا ہے، فرماتے ہیں :

> گورا چٹا سرخی گھلا ہوا اور صباحت کی مثال کتابی وبیضوی آمیزے کا چہرا، کھڑی ناک، بڑی بڑی آنکھیں، گھنیری بھنویں، متوسط القامت، نحیف الجسم، مستقیم القد وجود، گھنیری داڑھی، سر پر دو پلی ممتاز طور پر کھڑی ٹوپی، جو اُن کی شانِ امتیاز تھی، جاڑے اور گرمی دونوں موسموں میں بہ وقت ضرورت وخواہش خوب صورت جاذبِ رنگ کی شیروانی، ہاتھ میں ان کے ذوق لطیف کی غماز خوبصورت سی چھڑی، ہونٹوں پر ہلکی گلابی جو قدرتی گلابی سے گھل مل کر مزید پرکشش ہو جاتی تھی، اوپر کی جیب میں نستعلیق سا قلم، چال میں عالمانہ شان، نشست وبرخاست میں دین دارانہ امتیاز، حرکات سکنات سے صالحانہ عظمت ووقار کا ترشح، بات میں متوازن دھیما پن، عام مجلس ہو یا بزم خاص، ہر جگہ علم وفضل کی بارش، بیٹھے ہوں، یا چل رہے ہوں یا کھڑے ہوں، لوگ اُن کی دید سے اتنے محظوظ ہوتے کہ جس کی نظیر میں نے اپنی زندگی میں نہیں دیکھی، سلوک وبرتاؤ میں

نرمی اور دل میں اُس سے زیادہ نرمی و بردباری، جوش میں آتے، نہ بلند آواز سے بولتے، اس کے ساتھ ظرافت و بذلہ سنجی میں بھی ممتاز تھے، نثر و نظم دونوں پر قدرت تھی، اُن کا بڑا علمی سرمایہ تو نثر ہی میں ہے؛ لیکن اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعری میراث بھی چھوڑی ہے، اُن کی تقریر ہی کی طرح اُن کی تحریر بھی، بڑی سہل اور اُن کے زبردست علم وفکر کی ترجمانی کے باوجود، انتہائی رواں، سلیس اور شگفتہ ہوتی تھی، جو بہ ذاتِ خود اُن کا وجہِ امتیاز تھی۔ (پس مرگ زندہ)

درسگاہی چشمک بھی لوگوں کے قلم پر اثر انداز ہوتی ہے، افسوس کہ ہمارے نوجوان فضلاء میں یہ بیماری لا علاج بنتی جارہی ہے؛ لیکن مولانا امینیؒ ایسے تاثرات سے ماوراء تھے، انھوں نے اپنے زمانہ میں ندوہ کی سب سے نمائندہ شخصیت حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ پر کس محبت وعقیدت کے ساتھ قلم اُٹھایا، وہ دل کی آنکھوں سے پڑھنے کے لائق ہے، فرماتے ہیں :

اُن کی عربی اور اُردو دونوں یکساں طور پر روحانیت اور ایمان ویقین میں ڈھلی ہوئی اور قلب وجگر کے سانچے میں ڈھلی ہوئی ہوتی ہیں، مولانا کی ''انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر''، ''کاروان مدینہ''، ''جب ایمان کی بہار آئی'' کو بالخصوص اور انکی دیگر کتابوں اور دعوتی وفکری کتابچوں کو بالعموم، ایک سے زائد بار پڑھا ہے، آپ یقین کیجئے کہ بعض دفعہ وفورِ جوش وجذبات کی وجہ سے مجھے ایسا لگا کہ میرا سینہ چاک ہو جائے گا؛ چنانچہ میں بیٹھا ہوتا تو کھڑا ہو جاتا، اور کھڑا ہوتا تو ٹہلنے لگتا، نہ معلوم کتنی مرتبہ آنکھوں کو غسل صحت ملی اور عصیاں شعار وتوبہ شکن دل پر قلعی ہوئی، میرے جیسے سیکڑوں نہیں، ہزاروں ایسے بندگانِ خدا ہوں گے، جنھیں مولاناؒ کی تحریر وتقریر سے اس مبارک کیفیت کا توشہ ملا ہوگا اور ان شاء اللہ ملتا رہے گا، آخر کوئی بات ہے کہ عرب کے بڑے بڑے شاہانِ قلم وزبان، اپنا اپنا تاجِ شہنشاہ مولانا کے قدموں میں ڈال کر عقیدت کا خراج ادا کر کے نا قابلِ بیان فرحت وانبساط محسوس کرتے رہے ہیں۔ (پس مرگ زندہ)

مولانا کی مجلسوں میں بھی میں نے یہی قابل تقلید طرز گفتگو دیکھا کہ وہ نہ اس اختلاف کو گفتگو کا موضوع

بناتے اور نہ فریقین کے اکابر کی شان میں کوئی ایسی بات کہتے جو دوسرے فریق کے لئے دل آزاری کا سبب ہو، یہی طریقہ علماء کی شایان شان بھی ہے۔

مولانا اس حقیر سے عمر میں بھی چار سال بڑے تھے اور تعلیم سے رسمی فراغت کے اعتبار سے بھی کافی سینئر تھے؛ اس لئے زمانہ طالب علمی میں ان کو دیکھنے یا ان سے گفتگو کا موقع نہیں ملا؛ لیکن میں غائبانہ ان سے بہت متأثر تھا، اور اس کا دو بنیادی سبب تھا، ایک مردم گری کی صلاحیت، لگتا نہیں تھا کہ مولانا کیرانویؒ کے بعد دیوبند میں کوئی ایسی شخصیت ابھرے گی، جو اپنی صلاحیت سے ناتراشیدہ سنگ وخشت کو تراش سکے گی؛ لیکن مولانا امینیؒ نے بحمد اللہ اس روایت کو باقی رکھا، دوسرے دار العلوم کے عربی ترجمان ''الداعی'' کی شان وبان میں انھوں نے نہ صرف یہ کہ کمی نہ ہونے دی؛ بلکہ اس میں اضافہ فرمایا، اور اپنے سیال قلم سے عالم عرب میں بھی اس جریدہ کی وقعت میں اضافہ کیا۔

مولانا سے میری پہلی اور قریبی ملاقات اس وقت ہوئی جب دار العلوم سبیل السلام حیدرآباد میں ادب اسلامی کے موضوع پر ہندوستان گیر سطح پر سیمینار منعقد ہوا، برادر گرامی حضرت مولانا محمد رضوان قاسمیؒ کی خصوصی دعوت پر تشریف لائے، وہ عمر میں مولانا سے چھوٹے تھے اور زمانہ طالب علمی ہی سے مولانا قاسمی سے ان کا خوردانہ ربط تھا، اس کے بعد عرصہ تک ملاقات نہیں ہوئی، المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد کے قیام کے بعد جب مختلف مناسبتوں سے دار العلوم دیوبند کا سفر ہوا تو ان سے متعدد ملاقاتوں کا سلسلہ رہا، اکثر صبح کا ناشتہ ان کے دولت خانہ پر ہوتا، اور یہ پُر تکلف ناشتہ ہوتا، مولانا مہمانوں کو کھلا کر خوب خوش ہوتے، میرا معمول تھا کہ جانے سے پہلے اطلاع کرا دی تھا، مولانا کو یہ بات بہت پسند آتی تھی، ان کے بعض شاگردوں سے معلوم ہوا کہ وہ غائبانہ بھی اس کا ذکر کرتے تھے، اور طلبہ کو ترغیب دیتے کہ کہ اچانک کہیں پہنچنے سے گریز کریں، ایک بار ناشتہ پر میرے ساتھ ایک اور صاحب مدعو تھے، وہ دیکھنے میں بھی عجیب وغریب حلیہ کے حامل تھے، اور پھر بعض باتیں بھی ان کی زبان سے ایسی نکل گئیں جن کے لئے کم سے کم لفظ ''نامناسب'' کا ہوسکتا ہے، مولانا کا چہرہ سرخ ہوگیا اور چوں کہ ان کا مزاج اپنے غصہ کو ادھار رکھنے کا نہیں تھا؛ اس لئے ڈانٹ ڈپٹ بھی شروع ہوگئی، میں نے رُخ بدلنے کے لئے کہا کہ مجھے تو آپ سے بہت اہم مشورہ کرنا تھا، بحمد اللہ یہ تدبیر کام آئی، اور میں نے اشارہ سے ان صاحب کو خاموش رہنے کی ترغیب دی، اب ان مہمان کا نام اور مقام ہی ذہن بھی نہیں ہے۔

مولانا کے ایک صاحبزادے کا داخلہ حیدرآباد کے انجینئرنگ کالج میں اس حقیر کے واسطہ سے ہوا، اس وقت

ربط وضبط میں اور بھی اضافہ ہوا، جب مولانا علیل ہوئے اور معلوم ہوا کہ سانس کی تکلیف ہے تو اسی وقت سے دل دھڑکنے لگا کہ نہ معلوم یہ بیماری صحت پر ختم ہو یا منزلِ آخرت تک لے جائے، میں مولانا کے متعلق فون پر استفسار حال کرتا رہتا تھا، آخر وہی ہوا، جس کا ڈر تھا، اور مؤرخہ ۲۰/رمضان المبارک ۱۴۴۲ھ مطابق ۳/مئی ۲۰۲۱ء کو وہ اُس سفر پر روانہ ہو گئے، جہاں سے واپسی نہیں ہو سکتی، غفر انک لہ وکثر امثالہ۔

●●●

محدث اعظمیؒ کی چند اہم فقہی تالیفات کا مختصر تعارف

مولانا شکیل احمد مئوی ندوی
(رفیق شعبۂ تحقیق: المعہد العالی الاسلامی، حیدرآباد)

ہندوستان کی زرخیز سرزمین پر بہت سے علماء اور فقہاء پیدا ہوئے، بعض نے حدیث پر خدمت کی تو بعض نے فقہ وفتاویٰ پر؛ لیکن کسی پر کسی ایک فن کا رنگ غالب رہا اور دوسرے پر کسی دوسرے فن کا رنگ؛ لیکن بعض ایسے صاحب قلم وقرطاس بھی رہے ہیں کہ کئی فنون میں یکتائے روزگار تھے؛ لیکن ان کے کسی ایک فن سے ہی دنیا روشناس ہوسکی؛ انھیں میں ابوالمآثر مولانا حبیب الرحمن اعظمیؒ بھی تھے کہ دنیا ان کو محدث اعظمیؒ کے نام سے جانتی ہے؛ حالاں کہ آپ فقہ وفتاویٰ کے میدان میں مقام اجتہاد پر فائز تھے، آپؒ کی چند فقہی تصنیفات اور مضامین وفتاویٰ کا مختصر تعارف پیش خدمت ہے اس سے بخوبی اندازہ ہوسکتا ہے کہ آپؒ کی خدمات حدیث کے ساتھ فقہ وفتاویٰ پر بھی بہت اہم رہی ہیں اور اس سے ہمیں استفادہ کرنے کی ضرورت ہے۔

مولانا اعظمیؒ کا مختصر تعارف

آپؒ کا پورا نام حبیب الرحمٰن بن محمد صابر اور کنیت ابوالمآثر تھی، ۱۳۱۹ھ مطابق ۱۹۰۱ء میں اُتر پردیش کے مردم خیز اور صنعتی ضلع ''مئو ناتھ بھنجن'' میں پیدا ہوئے، والد ماجد مولانا صابر صاحب جید عالم دین تھے، ایک طویل عرصہ تک انھوں نے درس وتدریس کا فریضہ انجام دیا، ان کے استاذ مولانا ابوالحسن عراقی مئویؒ نے ''مدرسہ مفتاح العلوم مئو'' کی بنیاد رکھی تو والد محترم (مولانا صابر صاحب) کو بیک وقت نائب ناظم اور خزانچی کے عہدہ سے سرفراز کیا، جن کو انھوں نے بڑی خوش اُسلوبی سے نبھایا، والد ماجد حضرت تھانویؒ کے بہت ہی چہیتے مرید تھے اور حضرت تھانویؒ آپؒ کو بہت محبت اور عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے؛ آپ کی والدہ ماجدہ بہت ہی نیک اور خدا ترس خاتون تھیں، مولانا اعظمی کے تین بھائی (محمد، احمد، محمد) اور چار بہنیں (مریم، فاطمہ، رقیہ، میمونہ) تھیں، آپ کی دو بیویاں تھیں، آپؒ کی دس اولادیں ہوئیں، جو کہ سبھی علم وتقویٰ میں ممتاز تھیں ان میں آپؒ کے

جلیل القدر صاحبزادے اور آپ کے علمی میراث کے امین مولانا رشید احمد صاحب اعظمی ہیں اللہ آپ کا سایہ تادیر قائم رکھے۔

مولانا اعظمیؒ نے ابتدائی تعلیم اپنے والد صاحب سے ہی حاصل کی، اس کے بعد باضابطہ طور پر دارالعلوم مئو میں داخلہ لیا، ایک سال مدرسہ انجمن اسلامیہ گورکھپور میں مولانا عبدالغفار صاحب عراقی مئویؒ سے بھی اکتساب فیض کیا، جولائی ۱۹۱۹ء مطابق شوال ۱۳۳۷ھ میں دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا؛ لیکن بیماریوں اور دوسری مشکلات کی بنا پر کئی مرتبہ یہ سلسلہ منقطع ہوا اور آخر ۱۳۴۰ھ میں مجبوراً گھر واپس آنا پڑا، صحت یاب ہونے کے بعد مئو کی قدیم درسگاہ دارالعلوم میں داخلہ لیا اور مولانا کریم بخش سنبھلی تلمیذ رشید شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ کے پاس صحاحِ ستہ پڑھ کر دورۂ حدیث کی تکمیل کی اور سند فراغت و دستار فضیلت حاصل کی۔

آپ کے اساتذہ میں مولانا عبدالغفار صاحب عراقیؒ، مولانا کریم بخش سنبھلیؒ، امام العصر علامہ انور شاہ کشمیریؒ، مولانا شبیر احمد عثمانیؒ، مولانا ابوالحسن مئویؒ وغیرہ بہت مشہور ومعروف ہیں اور تلامذہ میں مولانا عبدالجبار مئویؒ، مولانا محمد منظور نعمانیؒ، مولانا محمد حسین بہاریؒ، مولانا عبدالستار معروفیؒ، مولانا قاری ریاست علی بجری آبادی مئویؒ، مولانا مفتی ظفیر الدین مفتاحیؒ، مولانا ضیاء الحسن اعظمیؒ اور مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی دامت برکاتہم العالیہ ہیں جنھوں نے اپنے استاذ کے علمی میراث کا بخوبی حق ادا کیا اور آج علم وفضل کے میدان میں محتاج تعارف نہیں۔

آپ نے مدرسہ مظہر العلوم بنارس، مدرسہ دارالعلوم مئو، مدرسہ مفتاح العلوم مئو، دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ وغیرہ میں تدریسی وانتظامی خدمات انجام دیں اس کے بعد المعہد العالی و مدرسہ مرقاۃ العلوم مئو کی بنیاد رکھی اور ان کی اپنے خون جگر سے آبیاری کی جو آج ایک شجر بار درخت بن کر تشنگان علوم نبوت کو سیراب وثمر بار کر رہے ہیں۔

مولانا اعظمیؒ کی چند اہم فقہی تالیفات

☆ الاعلام المرفوعۃ فی حکم الطلقات المجموعہ

تین طلاق کا مسئلہ دور حاضر میں بہت سنگین حیثیت کا حامل ہو چکا ہے، دور قدیم میں بھی یہ تین طلاق کا مسئلہ کہ ایک مجلس کی تین طلاقیں ایک شمار ہوں گی یا تین شمار ہوں گی؟ بہت ہی اہمیت کا حامل رہا ہے، اہل سنت کا

تقریباً اجماعی مسئلہ ہے کی ایک مجلس کی تین طلاق تین ہی شمار ہوں گی؛ چنانچہ علامہ اعظمیؒ نے اس مسئلہ کی اہمیت کو سمجھا اور اہل سنت کے موقف کی تائید وحمایت میں قلم اُٹھایا اور پھر''الاعلام المرفوعۃ فی حکم الطلقات المجموعۃ'' نامی کتاب تصنیف فرمائی؛ یہ کتاب تین طلاق کے وقوع واثبات پر بہت ہی جامع اور محقق ترین کتاب ہے، یہ کتاب اتنی محقق اور جامع ترین ہے کہ علامہ شبیر عثمانیؒ جیسے جید عالم دین اپنے شاگردوں کو اس کے مطالعہ کی تاکید فرمایا کرتے تھے۔

☆ الازہار المربوعہ فی رد الآثار المتبوعہ

آپ نے جو تین طلاق پر کتاب تصنیف فرمائی اس کے رد میں ایک غیر مقلد عالم مولانا عبداللہ شائق نے ''الآثار المبتوعۃ'' نامی کتاب لکھی، تو علامہ اعظمیؒ نے اس کتاب کا نہایت ہی تفصیلی اور جامع رد دو جلدوں میں ''الأزہار المربوعۃ'' کے نام سے تصنیف کرکے فرمایا، جس کا ایک حصہ تو تصنیف کے فوراً بعد شائع ہوگیا؛ لیکن دوسرا حصہ زیور طباعت سے آراستہ نہ ہوسکا، تین طلاق کے مسئلہ پر علامہ اعظمیؒ کی یہ دونوں کتابیں (الاعلام اور الازہار) اُردو زبان میں دوسری نہیں ملتیں کہ جس میں اس قدر احادیث اور آثار، قوت بیان اور استدلال کی مضبوطی باہم مجتمع ہوں، علامہ سید سلیمان ندویؒ اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے کچھ اس طرح رقمطراز ہیں :

> اس بحث میں ہمارے ہندی دوست، مصر کے مشہور حنفی مصری عالم شیخ نجیب سابق شیخ ازہر سے بہت آگے نکل گئے ہیں، جنھوں نے اسی بحث پر ایک رسالہ ''الأبحاث فی التطلیقات الثلاث'' لکھا ہے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ عقلیات کے علاوہ نقلیات میں بھی ہندوستان کا علم بحمداللہ مصر سے زیادہ ہے۔(۱)

☆ رکعات تراویح

تراویح کی رکعات کا مسئلہ مختلف فیہ رہا ہے، دور حاضر میں اس مسئلہ کو غیر مقلدین نے بہت زیادہ اچھالا ہے اور اُمت کے ساڑھے بارہ سو سالہ معمول سے روگردانی کرکے ایک عظیم فتنہ کی بنا رکھی ہے، اور اسے زندگی اور موت کی طرح بہت زیادہ اور گمبھیر مسئلہ بنا کر عوام کے سامنے پیش کیا ہے اور ایک بے مقصد چیز میں عوام کو اُلجھا کر ان کو ذہن ودماغ کو پراگندگی کا شکار بنا دیا ہے، انھیں سب چیزوں کے ازالہ اور سد باب کے لئے علامہ

---

(۱) حیاتِ ابوالمآثر: ۱/ ۱۸۲، ط: اول، بحوالہ: معارف: ۳۹۶، شمارہ: ۱۳۵۶ھ، مطابق: مئی ۱۹۳۷ء۔

اعظمیؒ نے یہ رسالہ ''رکعات تراویح'' تالیف فرمایا، جس میں دلائل وبراہین کی روشنی میں یہ ثابت کیا ہے کہ پوری دنیا میں سیدنا عمر فاروقؓ کے زمانۂ خلافت سے برابر بیس یا بیس سے زائد رکعتیں تراویح کی نماز میں ادا کی جاتی رہی ہیں؛ اس لئے صرف مخالفت اور عداوت پروری کی بنا پر بیس والی مرفوع روایت کو بالکلیہ ناقابل اعتناء گردانا، اور آٹھ والی روایتوں کی تصحیح اور ان پر اعتماد، اُصول حدیث کی تحقیق اور مسلماتِ مخالفین کی روشنی میں قطعاً درست نہیں ہے۔

یہ رسالہ ''رکعات تراویح'' معارف پریس اعظم گڈھ سے ۱۹۵۷ء میں شائع ہوا، ہندوستان کے علمی حلقہ میں اس رسالہ کو بہت پسند کیا گیا اور عبقری شخصیات کی جانب سے اسے بہت پزیرائی حاصل ہوئی؛ چنانچہ حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ نے اس رسالہ کے سلسلہ میں جو توصیفی کلمات ارشاد فرمائے ہیں وہ کسی سند سے کم نہیں؛ چنانچہ آپ ایک خط میں رقمطراز ہیں :

> مدعیان حدیث کی گندم نمائی اور جوفروشی کی وجہ سے بہت سے اشخاص اس غلطی میں مبتلا تھے کہ آٹھ رکعات تراویح کا ثبوت شرعی موجود ہے، حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمیؒ زیدمجدہم کی اس حقیقت نمائی نے جوموصوف نے اس رسالہ میں فرمائی ہے، باطل کے پردوں کی دھجیاں اُڑادیں اور کالشّمس فی رابعۃ النہار ظاہر کردیا کہ مدعیان حدیث کے دعاوی باطلہ ہرگز قابل التفات نہیں ہیں، میں نے رسالہ مذکورہ کو ابتدا سے اخیر تک مطالعہ کیا ہے، میں حضرت مولف ممدوح کی تحقیقات انیقہ اور دلائل قویہ پر حضرت کومبارکباد دیتا ہوں جنھوں نے ان مدعیوں کے خرمنہائے تزویر پر صواعق محرقہ برسا کر نیست و نابود کردیا ہے، جزاہ اللہ احسن الجزاء فی الدارین۔(۱)

☆ رکعات تراویح مذیل

علامہ اعظمیؒ نے جب رکعات تراویح'' نامی کتاب تصنیف فرمائی اور اس کو بہت زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی تو اس کے رد میں ایک غیر مقلد عالم نے ''انوار مصابیح'' نامی کتاب لکھی تو آپ نے اس کا ردکیا اور اس کے جواب میں آپ نے ''رکعات تراویح مذیل'' تصنیف فرمائی، یہ کتاب ۱۳۷۹ھ، مطابق: ۱۹۶۰ء میں تنویر پریس لکھنؤ سے شائع ہوئی۔

---

(۱) حیاتِ ابوالمآثر: ۱/۲۸۰-۲۸۱، ط: اول۔

☆ احکام النذر لأولیاء اللہ وتفسیر ما اھل بہ لغیر اللہ

اولیاء اللہ کے لئے جو نذریں مانی جاتی ہیں اور اس سلسلہ میں جو خرافات و بدعات اور مشرکانہ رسم ورواج ادا کی جاتی ہیں، ان کی اصلیت وحقیقت اور حرمت کی وضاحت کے لئے علامہ اعظمیؒ نے یہ رسالہ ''احکام النذر لاولیاء اللہ وتفسیر ما اھل بہ لغیر اللہ'' تصنیف فرمایا جو ماہنامہ ''الفرقان'' (بریلی) میں شوال، ذیقعدہ، ذی الحجہ ۱۳۵۸ھ کے شماروں میں شائع ہوا۔

☆ رہبر حجاج

حج کا موضوع اتنا دلفریب اور مقدس ہے کہ بہت سے اصحابِ قلم نے اس پر طبع آزمائی کی اور تشنگان علوم اسلامیہ کو اس سے سیراب کیا؛ انھیں میں مولانا اعظمیؒ کی یہ کتاب رہبر حجاج بھی ہے، آپؒ نے اس کتاب میں حج کے احکام ومسائل کو مستند حوالوں سے ذکر کیا ہے، اس کتاب کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس کی زبان بہت ہی سہل اور عام فہم ہے کہ عام پڑھے لکھے لوگ بھی حج کے احکام، اس کے مستحبات ومنکرات کو بخوبی سمجھ سکیں، ساتھ ہی علامہ اعظمیؒ کا میدان بحث وتحقیق تو ہے ہی؛ اس لیے اس میں محققانہ رنگ بھی موجود ہے، اسی ضمن میں اس کتاب کے اندر دو اہم مسائل پر آپ نے محققانہ بحث فرمائی جو اس کتاب کو انفرادیت بخشتی ہے، ان دونوں مسائل سے عوام الناس کے ساتھ علماء کرام اور اہل علم طبقہ کی معلومات میں بھی اضافہ ہوگا؛ اول بعد نماز فجر وعصر طواف کی دو رکعات پڑھنے کا مسئلہ ہے، دوم کثرت عمرہ کا مسئلہ ہے، بعض لوگ اس سلسلے میں بہت تشدد کا شکار ہیں، ان کا ماننا ہے کہ اگر فجر وعصر کے بعد طواف کیا جائے تو اسی وقت طواف کی واجب نماز ادا کرنا ضروری ہے؛ جب کہ حنفیہ کے نزدیک اس وقت نفل نماز مکروہ ہے؛ اسی طرح بعض لوگ کثرت عمرہ کو بدعت گردانتے ہیں، علامہ اعظمیؒ نے اس رسالہ میں ان دونوں مسائل پر سیر حاصل بحث کی ہے۔

اس کتاب میں اول حج کی فرضیت، حج کا مسنون طریقہ، احرام اور حالت احرام میں کن چیزوں سے اعتناء لازم ہے یہ ساری تفصیلات مذکور ہیں، اس کے بعد بالتفصیل سلسلہ وار طریقہ حج تحریر کرنے کے بعد مقامات مقدسہ کی تفصیلات ذکر فرمائی ہیں؛ آپؒ نے اس کتاب میں تنبیہات کے عنوان سے بہت سارے اہم اور قابل ذکر اُمور کی جانب توجہ دلائی ہے، جیسے بلند آواز سے دُعا پڑھنا یا پڑھانا جس سے دوسرے طواف وعبادت کرنے والوں کو تکلیف ہو اس سے سختی سے منع فرمایا ہے؛ اول یہ کتاب 1382ھ مطابق 1963ء میں

شائع ہوئی اور اب تک اس کے سات ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں، اسی سے اس کتاب کی مقبولیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔(۱)

☆ بیمہ اور اس کا شرعی حکم

مادیت پسندی کے اس دور میں جب کہ ہر کوئی اپنا منافع سوچتا ہے اور اس کے پیچھے ایسا دیوانہ ہے کہ حلال وحرام کی تمیز بھی بسا اوقات مٹا دیتا ہے، ہر وقت اس کے ذہن ودماغ میں ''ہل من مزید'' کی صدائے باز گشت کرتی رہتی ہیں، کسی کار خیر میں حصہ لینے کے لیے بھی اکثر منفعت پیش نظر ہوتی ہے؛ حالاں کہ یہ بات بالکل واضح ہے کہ انسان کی خواہشات کی تکمیل تو قبر میں ہی ہوسکتی ہے اور اس کے اس نہ مٹ پانے والی بھوک کو قبر کی مٹی ہی بھر سکتی ہے؛ مادی منفعت کے وسائل میں یہ بیمہ (انشورنس) بھی ہے، جو توکل اور شریعت اسلامی کے مخالف ہے، شریعت ہمیں اپنے رب سے قریب کرنے اور اسی سے اپنی ضروریات اور مسائل کو حل کرانے کی ترغیب دیتی ہے، مادی وسائل کو سبب کے ذریعے میں رکھ کر اصل بھروسہ رب کریم سے استوار کرنے کی ترغیب دیتی ہے، بیمہ میں آگے ہونے والے خطرات وخدشات کی بنا پر ایک متعینہ رقم یک مشت یا قسط وار ادا کی جاتی ہے، جس کے بدلے میں معاہدہ کیا جاتا ہے جس میں اس بات کی ضمانت ہوتی ہے کہ وہ لوگ اس نقصان کی تلافی کریں گے اور ساتھ ہی یہ رقم واپس لوٹائیں گے۔

اس بیمہ (انشورنس) کا آغاز قرون وسطی میں (تقریباً: ۱۴۹۸ء) میں لویڈز نامی لندن کے ایک مشہور قہوہ خانے میں ہوا؛ اسلامی شریعت کے رو سے انشورنس جائز ہے یا ناجائز، فقہاء کے درمیان مختلف فیہ بحث ہے، بعض علماء اس کے جواز کے قائل ہیں جیسے استاذ مصطفیٰ زرقاء، استاذ عبدالرحمٰن عیسیٰ، استاذ محمد یوسف موسیٰ اور استاذ علی خفیف، ان کے علاوہ بعض ہندوستانی علماء کے یہاں بھی جواز کا رجحان پایا جاتا ہے؛ بیمہ کو حرام قرار دینے والے فقہاء میں اہم نام علامہ شیخ محمد بخیت المطیعی حنفی، علامہ محمد ابوزہرہ، ڈاکٹر عیسیٰ عبدہ، شیخ عبداللہ ناصح علوان اور مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمیؒ وغیرہ کے ہیں، ہندوستان کے قدیم فقہاء میں زیادہ تر عدم جواز کے قائل ہیں، (۲) ۱۹۶۴ء کے اوائل کی بات ہے کہ مشہور عالم، مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کے ناظم دینیات مولانا محمد تقی امینی علیہ الرحمہ مجلس تحقیقات شرعیہ ندوۃ العلماء لکھنو کی جانب سے لائف انشورنس کے متعلق متعدد مضامین وتحقیقات کی

---

(۱) مستفاد از: رہبر حجاج: ۲۶/۶، ط: ہفتم۔

(۲) مولانا حبیب الرحمٰن اعظمیؒ اور ان کی علمی خدمات، از: ڈاکٹر محمد صہیب: ۲۸۱، ط: اول۔

روشنی میں ایک مبسوط اور مفصل تحریر مرتب کر کے محدث جلیل حضرۃ العلامہ مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی قدس سرہ کی خدمت میں اس کی تائید اور نظر ثانی کی غرض سے لائے، اس تحریر میں انشورنس کے جواز کا رجحان پیش کیا گیا تھا، حضرت کو اس سے اختلاف تھا؛ چنانچہ اس کو پڑھ کر حضرت نے ایک تنقیدی جائزہ اس پر تحریر فرمادیا؛(۱) مولانا اعظمیؒ نے اس تحریر کا مفصل جائزہ لیا اور ۲۱ نکات پر مشتمل نوٹ رقم فرمایا جس کو بعد میں ''بیمہ اور اس کا شرعی حکم'' کے نام سے شائع کیا گیا، اس تحریر میں آپ نے بیمہ کے جواز کے شواہد کا دلائل کے ساتھ رد فرمایا اور غلطیوں پر تنبیہ فرمائی، مولانا محمد تقی امینی صاحب کا مضمون بہت مفصل ہے اس کو نقل کرنے کے بجائے علامہ اعظمیؒ کے ذکر کردہ نکات سے چند کو پیش کرتے ہیں :

1- پس اندازی کے رجحان کو فطری کہہ کر ظاہر کرنا کہ وہ تمام تر محمود رجحان ہے، میں اس سے متفق نہیں ہوں، فطرت سلیمہ کا تقاضا وہ چیز ہے جو محمد رسول اللہ ﷺ کی قولی و عملی تعلیمات سے ثابت ہوتی ہے، جو حریصانہ پس اندازی اور مسرفانہ انفاق کے درمیان ایک نہایت معتدل رجحان ہے، اور جس میں پس اندازی سے زیادہ انفاق کا عنصر نمایاں ہے۔

2- بیمہ کا اہم مقصد اثاثہ جمع کر کے مستقبل کے غیر متوقع حادثات و خطرات کا مقابلہ کرنا ہے، یہ بات غایۃ الغایات کی حد تک تو کسی درجہ میں صحیح ہوسکتی ہے؛ لیکن بیمہ کی اولین غرض وہ ہوتی ہے جو ''بیمہ کی قسموں'' کے عنوان کے تحت مذکور ہے، یعنی مال یا اطراف کے امکانی نقصان کی تلافی۔

3- دارالاسلام و دارالحرب کی بحث کو حل کی بنیاد بنانا مناسب ہو یا نہ ہو، سوال یہ ہے کہ بیمہ اگر ربوی معاملہ یا قمار ہے، تو دونوں جگہ اس کا حکم یکساں ہے یا الگ الگ؟

4- مستقبل کی ضمانت تو نہ کسی کے علم میں ہے نہ مقدور؛ اس لیے مستقبل کی ضمانت کا عنوان غیر شرعی ہونے کے ساتھ غیر منطقی بھی ہے؛ ہاں خطرات سے حفاظت کا جذبہ انسان کی فطرت میں ودیعت ہے، یہ مسلم ہے اور یہ بھی مسلم ہے کہ

---

(۱) المآثر، شمارہ:۲، جلد:۳، بحوالہ بیمہ اور اس کا شرعی حکم:۹، ط:اول۔

انسان اپنی حفاظت کے لیے پیش بندی کے طور پر بہت سے انتظامات کرتا ہے؛ لیکن وہ سارے انتظامات ایسے ہوتے ہیں کہ ان میں اور حفاظت میں ایک معقول ربط ہوتا ہے، انتظام سبب اور حفاظت مسبب ہوتی ہے، مثلاً وبا کے زمانہ میں مکان وغیرہ کا صاف ستھرا رکھنا، جراثیم کش دواؤں کا چھڑکنا، اور اسی طرح کی دواؤں اور غذاؤں کا استعمال، یا وبا کے مریضوں سے اختلاط سے پرہیز وغیرہ؛ لیکن بیمہ اور حفاظت میں کوئی عقلی و منطقی ربط نہیں ہے، نہ بیمہ کا مقصود در حقیقت حفاظت کا تحقق ہے؛ بلکہ بیمہ تو درحقیقت حفاظت کی ایک بے دلیل پیشین گوئی ہے، جو اگر سچی ہوگئی تو کمپنی تاوان دینے سے بچ جائے گی اور جھوٹی نکلی تو بیمہ کمپنی کو تاوان ادا کرنا پڑے گا، علماء کرام کو سوچنا چاہئے کہ بیمہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے، جو کم از کم سبب ہی کے درجہ میں سہی انسان کو کسی خطرہ سے بچانے میں مؤثر ہو، اور جب ایسا ہے تو اس کو حفاظت کا انتظام قرار دینا نہایت عجیب بات ہے؛ حفاظت کا جذبہ بے شک فطری ہے اور انتظامِ حفاظت کے جتنے فطری طریقے ہیں وہ ہمیشہ سے رائج ہیں اور بیمہ چوں کہ بالکل غیر فطری طریقہ ہے؛ اس لیے ابتداء آفرینش سے لے کر اب سے چند سال پہلے تک جو بہت ہی طویل مدت ہے، فطرت نے اس کی طرف کبھی رہنمائی نہیں کی، مدتہائے دراز کے بعد جب فطرتِ سلیمہ مسخ ہوگئی تو ''حفاظت کا یہ نیا طریقہ'' ایجاد ہوا۔(۱)

علامہ اعظمیؒ کو اپنے ہم عصروں میں یہ امتیاز حاصل تھا کہ جملہ علوم اسلامیہ میں ان کو مہارت تامہ حاصل تھی، حدیث تو آپ کا اوڑھنا بچھونا تھا ہی؛ لیکن دوسرے علوم میں بھی آپ کا تبحر علمی تسلیم شدہ تھا، تفسیر، فقہ، ادب، فلسفہ، تاریخ پر بھی آپ کو مہارت حاصل تھی، فقہ و فتاویٰ کے سلسلے میں آپ کی یہ شان تھی کہ ۱۳۶۴ھ مطابق ۱۹۴۵ء میں برصغیر (غیر منقسم ہندوستان) میں ایک سے بڑھ کر ایک اصحاب فقہ و فتاویٰ موجود تھے؛ لیکن آپ کو دارالعلوم دیوبند کی صدارت افتاء کا عظیم الشان منصب پیش کیا گیا، فقہ میں آپ کی نگاہ جس قدر باریک اور دوررس تھی، نصوص فقہ میں اور عبارات فقہاء پر ان کی گرفت جس قدر مضبوط تھی ان کے ہم عصروں

(۱) مستفاد از: بیمہ اور اس کا شرعی حکم: ۱۳/ ۲۴، ط: اول۔

میں شاید ہی باید کوئی آپ کا ہم پلہ ہوسکتا ہو، بیمہ کے موضوع پر ''حکم الاسلام فی التامین'' جس کے مصنف شیخ عبداللہ ناصح علوان ہیں، ڈاکٹر مسعود احمد اعظمی نے اس کو اردو قالب میں ''بیمہ کے بارے میں اسلام کا حکم'' کے نام سے ڈھالا ہے، ۱۴۲۳ھ مطابق ۲۰۰۲ء میں بیمہ کے موضوع پر مولانا اعظمیؒ اور شیخ عبداللہ ناصح علوان کی تحریر ایک ساتھ ''بیمہ اور اس کا شرعی حکم'' کے نام سے استفادہ کی غرض سے شائع کی گئی ہے۔

☆ دارالاسلام اور دارالحرب

ہندوستان کی زمام کار جب مسلم فرمانرواؤں کے ہاتھ سے پھسل کر انگریزوں کے ہاتھ میں چلی گئی تو بہت ساری تبدیلیوں کے ساتھ یہ بات بھی موضوع گفتگو بن گئی کہ ہندوستان اب دارالاسلام باقی ہے یا دارالحرب بن گیا ہے؟ تو اس وقت کے عظیم محدث حضرت مولانا شاہ عبدالعزیزؒ کی خدمت عالیہ میں جب استفتاء پہنچا تو آپؒ نے ہندوستان کے دارالحرب ہونے کا فتوی صادر فرمایا؛ لیکن جب ملک کو آزادی ملی اور جمہوری نظام قائم ہوا تو اس کے بعد پھر یہ مسئلہ زیر بحث آیا کہ اب ہندوستان کی شرعی حیثیت دارالحرب کی ہے یا دارالاسلام کی؟ اس موضوع پر بہت سے اصحاب قلم نے خامہ فرسائی کی جس میں مولانا قاسم نانوتویؒ، مولانا مناظر احسن گیلانیؒ جیسے بزرگان دین بھی ہیں، اس پر علامہ اعظمیؒ نے بھی قلم اُٹھایا اور پھر منصۂ شہود پر ''دارالاسلام اور دارالحرب'' وجود میں آئی؛ اس میں آپؒ نے اکابر فقہاء کی آراء اور ان کی کتابوں سے عرق ریزی کے بعد اپنا فیصلہ تحریر فرمایا اور لکھا کہ :

> فقہاء کے مذکورہ بالا ارشادات کی رو سے ہندوستان کا دارالحرب ثابت ہونا ناممکن ہے اور ان کی رو سے بلا شک وشبہ دارالاسلام ہے۔(۱)

مزید آپ فرماتے ہیں کہ :

> فقہا کی عبارت کی توضیح یہ ہے کہ جس دارالحرب پر مسلمانوں کا قبضہ ہوا اور اس میں احکام اسلام جاری ہو گئے، مثلاً جمعہ وعیدین کی نمازیں پڑھی جانے لگیں، تو وہ دارالاسلام ہو گیا، اس کا دارالاسلام بننا نہ اس پر موقوف ہے کہ اس میں کوئی کافر اصلی باقی نہ رہے، نہ اس پر کہ وہ دوسرے دارالاسلام سے سے متصل ہو۔(۲)

---

(۱) دارالاسلام اور دارالحرب: ۲۸، ط: اول۔

(۲) دارالاسلام اور دارالحرب: ۵۴، ط: اول۔

حضرت نانوتویؒ کی رائے بھی ہندوستان کے دارالاسلام ہونے کی ہے؛ اگر چہ ان کا رجحان دارالحرب قرار دینے کا تھا؛ لیکن فقہاء کی آراء کے سامنے اپنی ذاتی رائے کو ترجیح نہیں دی :

باعتبار روایات منقولہ ہندوستان دار الاسلام است

اسی بنا پر ہندوستان کے اکثر محققین فقہاء نے اسے دارالحرب قرار دینے سے اجتناب برتا ہے؛ البتہ بعض حضرات اسے دارالحرب تو نہیں ؛ بلکہ دارالامان قرار دیتے ہیں ، مولانا اعظمیؒ نے مولانا محمد میاں ، مولانا سعید احمد اکبرآبادی اور مولانا مناظر احسن گیلانیؒ پر خاص طور سے رد کیا اور دلائل و براہین کی روشنی میں ان کے موقف کی تردید فرمائی ، آپؒ کا یہ کارنامہ فقہ وفتاویٰ کی لائین میں ایک اہم ترین اضافہ ہے اور آپ کی فقہی بصیرت کا زندہ و جاوید مظہر ہے ؛ پہلی مرتبہ باضابطہ یا رسالہ 1423ھ مطابق 2002ء میں مرکز تحقیقات وخدمات علمیہ مئو سے ''دارالاسلام اور دارالحرب'' کے نام سے شائع ہوا ، اس سے قبل مختلف رسائل وجرائد میں یہ منظر عام پر آچکا تھا۔

آج کل لوگ ''حالات کی تبدیلی سے مسائل واحکام بدل جایا کرتے ہیں'' کے اُصول کو ہتھیار بنا کر من چاہے فیصلے کرنے لگے ہیں ، ان لوگوں کے سلسلے میں علامہ اعظمیؒ سختی کے ساتھ تنبیہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

> مجھے ان مفتیوں پر رحم آتا ہے (اور میں از راہِ دلسوزی ان کے حق میں دُعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ان کو دین کی سمجھ دیں) جو موقع و بے موقع یہ کہنے کے عادی ہو گئے ہیں کہ:
> ''حالات کی تبدیلی سے مسائل میں لچک پیدا ہو جاتی ہے''۔

معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ اپنے کو شارع اور اپنے اقوال وآراء کو مستقل بالذات حجت سمجھتے ہیں کہ جو منھ میں آتا ہے کہہ دیتے ہیں اور اس پر قرآن وحدیث یا کسی مسلّم مجتہد کے اجتہاد سے کوئی سند پیش کرنے کی ضرورت ہی نہیں سمجھتے ، ان سے کون پوچھے کہ :

> 1- حالات کی تبدیلی سے کیا مراد ہے؟ کیا یہ کہ مسئلہ پر عمل ناممکن ہو جائے یا اس پر عمل کرنے سے جان جانے کا خطرہ ہو؟ یا کوئی چیز سنت کے درجہ کی ہے اور اس پر عمل کرنا ترکِ فریضہ کا مستلزم ومستوجب ہو جائے؟ یا جس مصلحت سے حکم دیا گیا ہے ، عمل کیا جائے تو اس مصلحت سے کہیں بڑا مفسدہ لازم آئے گا؟ یا حالات کی تبدیلی کا مطلب یہ ہے کہ پہلے مغربی آزاد خیالی کا دور دورہ نہیں تھا ،

زمانہ نے اتنی ترقی نہیں کی تھی ، دنیا کے لوگوں نے اپنا معبود نہیں بنایا تھا ، غیر اسلامی معاشرہ ، اور غیر دینی تہذیب کو سرمایہ افتخار وعزت نہیں سمجھا جاتا تھا اوراس سے دُور رہنے میں ذلت ، بدنامی اور رُسوائی کا اندیشہ نہیں تھا اور نہ یہ طعنے سننے پڑتے تھے کہ مسلم قوم ایک تاریک خیال ، غیر ترقی پسند ، اور زندگی کی دوڑ بھاگ میں دوسری قوموں سے پیچھے رہنے والی قوم ہے۔

2- اگر حالات کی تبدیلی سے یہی دوسری تبدیلی مراد ہے تو ذرا تکلیف کر کے یہ بھی ارشاد ہو کہ اس قسم کی تبدیلی سے مسائل میں کیا لچک پیدا ہوتی ہے؟ کیا یہ کہ ایک چیز حرام سے حلال ہو جاتی ہے؟ یا یہ کہ حرام کے بجائے مکروہ ہو جاتی ہے؟ بہر حال جو بھی ہو اس کو ماننے اور منوانے کے لیے دلیل کی ضرورت ہے ، صرف آپ کا کہہ دینا کافی نہیں ہے۔

اگر کوئی کہے کہ آج مغربی تہذیب اور مغربی تمدن ایسا چھا گیا ہے کہ اس دور میں لڑکیوں کو بھی اگر انگریزی کی اعلیٰ تعلیم نہ دلوائی جائے تو مغرب زدہ سوسائٹی میں لڑکی جاہل و نامہذب سمجھی جائے گی اور کسی جج ، بیرسٹر ، کلکٹر ، پارلیمنٹ کے ممبر یا یونیورسٹی کے پروفیسر یا کالج کے لکچرر کی رفیقہ حیات نہیں بن سکتی ؛ اس لیے اعلیٰ انگریزی تعلیم دلوانا بے حد ضروری ہے اور ظاہر ہے کہ یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ اسکولوں ، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں لڑکیاں اجنبی اور نامحرم لڑکوں کے ساتھ کلاسوں میں نہ بیٹھیں ؛ بلکہ بسا اوقات ان کو اندرون ملک و بیرون ملک بلا محرم کی معیت کے ریلوں اور ہوائی جہازوں میں سفر بھی کرنا پڑے گا ، تو میں جاننا چاہتا ہوں کہ کیا مذکورہ بالا ضرورت قرآنی واسلامی نقطۂ نظر سے ایسی ضرورت شدیدہ ہے کہ اس کے لیے نامحرموں کے ساتھ اختلاط اور بلا محرم کے سفر جائز قرار دے دیا جائے ، اگر ہاں ! تو اس کی کیا دلیل ہے؟ اسی کے ساتھ یہ بھی فرمایا جائے کہ اس تعلیم کا سو فیصدی نہیں بلکہ نوے ہی فیصدی اگر یہ نتیجہ ہو کہ یہ لڑکیاں ننگے سر (یا کوئی ایسا کپڑا سر پر ڈال کر جو بجائے بالوں کو چھپانے کے ان کی زینت بڑھاتا ہو) کھلے سینوں کے ساتھ اور ایسے لباسوں میں جو ان کے محاسن کو چھپانے کے بجائے ان کی نمائش کرتے ہوں ، بازاروں سے گذریں ، ریلوں میں سفر کریں اور نامحرم نوجوانوں کے شانہ بشانہ کلاسوں میں ، تفریح گاہوں میں اور دوسری مجالس و محافل میں بیٹھیں ، تو کیا مذکورہ بالا ضرورت کا شرعی تقاضا ہے کہ اس عریانی کو بھی جائز کہہ دیا جائے ؟ اگر جواب اثبات میں ہے تو ہم دلائل جواز سننا چاہتے ہیں۔

موقع ومحل کی مناسبت سے ہم مفتیان زمانہ کی زبانی حالات کی اس تبدیلی کی داستان بھی سننا چاہتے ہیں، جس نے یہ لچک پیدا کر دی ہے کہ زنانہ مسجد کی تعمیر ناگزیر ہوگئی اور مردوں کے شانہ بشانہ مسجدوں میں عورتوں کا نماز پڑھنا ناجائز یا ناپسندیدہ کام نہیں رہ گیا، ہم جاننا چاہتے ہیں کہ حالات میں کیا تبدیلی ہوئی اور اس نے کیا ایسی مجبوری پیدا کر دی کہ رسول خدا ﷺ کی مندرجہ ذیل پاکیزہ تعلیمات اور روشن ہدایات کو تقویم پارینہ کا درجہ دیدیا جائے؟

۱- مسند احمد میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اپنے پیچھے نماز پڑھنے سے بھی افضل عورت کے حق میں یہ قرار دیا ہے کہ وہ اپنے گھر میں نماز پڑھے اور فرمایا کہ عورت مسجد جماعۃ عامہ سے جس قدر دُور رہے اتنا ہی بہتر ہے۔

۲- ترمذی وغیرہ میں روایت ہے کہ اگر عورتوں کو مسجد میں جانے کی اجازت دو تو رات کی تاریکی میں (تاکہ نامحرم کی نظر نہ پڑے)۔

۳- ابوداؤد کی روایت میں ہے اگر عورتیں مسجد میں جائیں بھی تو خوشبو لگا کر نہ جائیں۔

۴- حضرت عائشہؓ کا ارشاد بخاری وغیرہ میں مروی ہے کہ آج جو عورتوں نے نئی باتیں نکالی ہیں، ان کا مشاہدہ رسول خدا ﷺ فرماتے تو ان کے حق میں مسجد کا داخلہ قطعاً ممنوع قرار دے دیتے۔

میں مفتی صاحبان سے معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ حالات کی وہ کیا تبدیلی ہے جس کا شرعی تقاضا یہ ہے کہ عورتوں کی اس انچ پر کہ ایک زنانہ مسجد تعمیر ہونی چاہئے، نکیر اور اظہار بیزاری کے بجائے ان کی حوصلہ افزائی کی جائے۔(۱)

☆ انساب وکفاءت کی شرعی حیثیت

شریعت کے بعض احکام قطعی ہیں تو بعض احکام میں اجتہاد کی راہیں کھلی ہوئی ہیں، جن مسائل میں بے اعتدالی اور تعارض کو راہ ملتی ہے ان کا تعلق انھیں اجتہادی مسائل سے ہے، کچھ چیزوں کا تعلق انتظامی پہلوؤں سے ہوتا ہے جس کو لوگوں نے اصل بنالیا اور بے اعتدالی کا شکار ہو گئے جیسے ذات پات، علاقائیت اور پیشہ وروزگار کا مسئلہ، اللہ رب العزت تو فرماتے ہیں کہ ہم نے تو ذات پات اور قبائل وخاندان کی تقسیم پہچان وتعارف کے لئے کی ہے ورنہ سبھی ایک ہی ماں باپ یعنی آدم وحوا کی اولاد ہیں، اصل چیز جس سے انسان اعلیٰ یا ادنیٰ بنتا ہے وہ تقویٰ اور پرہیزگاری ہے :

(۱) دارالاسلام اور دارالحرب: ۱۱۴-۱۱۷، ط: اول۔

إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ ۔ (۱)

اور یہی چیز انسان کو اللہ کی نظر میں بڑا اور چھوٹا بناتی ہے ورنہ ایک خاندان کی دوسرے خاندان کے اوپر کوئی برتری نہیں ہے؛ لیکن یہاں علاقائی، خاندانی اور دوسری تمام نسبتوں کی بنا پر لوگ سخت بے اعتدالی کا شکار ہیں اور ستم بالائے ستم اس کو مذہبی رنگ دیئے جانے کی کوشش بھی کرتے ہیں؛ حالاں کہ یہ صرف ایک انتظامی پہلو کے تحت رنگ و نسل کا فرق ہے جس میں حسبِ ضرورت ترمیم ہوتی رہتی ہے اور یہ چیز مزاج شریعت کے عین موافق ہے؛ کفاءت کے سلسلہ میں اصل چیز علم و عمل، زہد و تقویٰ اور پرہیزگاری ہے؛ اس لیے اگر کوئی عجمی علم و عمل کے میدان میں ممتاز ہو تو عربی کا کفو بن سکتا ہے، اس سلسلے میں بہت ساری مثالیں علامہ اعظمیؒ نے پیش کی ہیں جن کا نکاح ظاہری طور پر غیر کفو میں ہوا :

> حضور ﷺ نے اپنی خاص چچا زاد بہن حضرت ضباعہؓ کا نکاح حضرت مقداد کندیؓ سے کیا جو کہ قریشی قبیلہ سے نہیں تھے، آپ کی پھوپھی زاد بہن حضرت زینبؓ کا نکاح حضرت زیدؓ سے ہوا جو کہ غلامی کی زندگی بسر کر چکے تھے، حضرت فاطمہؓ جو کہ ایک قریشی خاتون تھیں ان کا نکاح حضرت اسامہؓ جو کہ آپ کے آزاد شدہ غلام تھے ان سے کیا، حضرت بلالؓ جن کا حبشی اور غلام ہونا سب کو پتہ ہے ان کا نکاح حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ قریشی کی بہن سے ہوا؛ اسی طرح اکابر علماء میں سے حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ جو کہ عجمی النسل تھے ان کا نکاح فاروقی گھرانے میں ہوا۔(۲)

کفاءت کے مسئلے میں جب بے اعتدالی پیدا ہوئی تو اس کی وجہ سے شرافت نسب اور مختلف پیشوں اور حرفتوں کی عزت و عظمت اور پیشہ وروں واہل حرفت کی شرافت و ناموس کے مسائل بھی زیر بحث آئے، قرآن و حدیث نے تو صاف الفاظ میں بتا دیا کہ تمام انسانوں کا نسب ایک ہی ہے، مختلف خاندان و قبائل وجود میں آئے؛ لیکن ان کا مدار عزت و شرافت پر نہیں؛ بلکہ اصل سربلندی کا مدار تقویٰ ہے، اسلام تو ہمیں ایک ہونے کی دعوت دیتا ہے؛ لیکن ہندوستان کا قدیم ہندوانہ مزاج جوذات پات پر قائم تھا اور اب بھی اسی طرح سے ہے کہ

---

(۱) الحجرات:13۔ (۲) مستفاداز: انساب وکفاءت کی شرعی حیثیت: ۶۸-۶۹، ط: اول۔

ہزار کوششوں کے باوجود اس میں کمی واقع نہیں ہوسکی وہ ہمارے ذہنوں سے نہ نکل سکا اور ہم بھی وحدت کو چھوڑ کر رنگ ونسل اور ذات پات کی تفریق کے شکار ہوگئے، یاد رکھنا چاہیے کہ یہ ذات برادری کی تفریق کا تصور بہر حال ایک غیر اسلامی چیز ہے، عام طور سے علماء بھی اس غلط تصور کے خلاف پوری قوت سے مقابلہ کرتے ہیں؛ لیکن جب برتاؤ اور عمل کا وقت آتا ہے تو بسا اوقات خود اس کا شکار ہوجاتے ہیں اور نکاح کے معاملے میں تو شرعی دلائل سے اس تفریق کو قوت پہنچائی جاتی ہے اور جو تصور صدیوں سے ذہن ودماغ میں رچ بس گیا ہو جب اسی کے موافق کوئی بات آتی ہے تو بنا کسی ردوقدح کے اسے قبول کرلیا جاتا ہے؛ بلکہ اس کے سلسلہ میں آیات صریحہ اور احادیث صحیحہ میں بھی تاویل در تاویل کی جاتی ہے اور منکر وضعیف؛ بلکہ موضوع روایات کو وجہ استدلال بنایا جاتا ہے، یہ تمام باتیں حضرت محدث اعظمیؒ کے سامنے تھیں، ساتھ ہی ایک رسالہ حضرت مفتی شفیع صاحبؒ نے ''نہایات الارب فی غایات النسب'' تحریر فرمایا جس میں انساب اور پیشوں کے تفاضل پر بحث کی گئی اور بہت سے لوگوں کے لیے اس میں دل آزاری کی باتیں بھی آگئیں، جس کی بنا پر لوگوں میں بہت شور وغوغا بھی ہوا اور اس میں علماء اسلام بلکہ اسلام کے تئیں لوگوں کے دلوں میں بدگمانیاں پھیلنے لگیں اور مسلمانوں کے مختلف طبقوں کو علماء سے شکایتیں پیدا ہوگئیں؛ ان تمام چیزوں کی وجہ سے حضرت محدث اعظمیؒ نے اس موضوع پر قلم اُٹھایا، آپؒ بہت خاموش مزاج، متواضع، خاشع وخاضع اور اپنے بزرگوں کا بے حد احترام کرنے والے تھے؛ لیکن جب دفاع دین اور دین میں تحریف وترمیم کی بات آجاتی تھی تو پھر آپ پر شان صدیقی وفاروقی غالب آجاتی تھی اور آپؒ دین میں کسی طرح کی کتر وبیونت برداشت نہیں کرتے تھے؛ اسی پس منظر میں یہ رسالہ ''انساب وکفاءت کی شرعی حیثیت'' تحریر فرمایا جو 1420ھ مطابق 1999ء کو پہلی بار مرکز تحقیقات وخدمات علمیہ، مرقاۃ العلوم مئو (یوپی) سے شائع ہوا؛ اس کتاب میں مولانا اعظمیؒ نے مسئلہ کفاءت پر بہت مدلل انداز سے روشنی ڈالی اور اس سلسلے میں صحابہ اور علماء اسلام کی آراء بھی نقل کیں، آپؒ تحریر فرماتے ہیں :

> علماء اسلام میں بہت سے لوگ تو دین کے سوا کسی اور بات میں کفاءت کا بالکل اعتبار نہیں کرتے؛ چنانچہ صحابہ کرام میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور حضرت ابن عمرؓ اور تابعین میں عمر بن عبدالعزیزؒ اور ابن سیرینؒ، اور ائمہ میں امام مالکؒ کی یہی رائے ہے، (۱) اور صاحب بدائع نے بھی یہی مذہب حسن بصریؒ اور سفیان

(۱) عمدۃ القاری:3/77وفتح الباری:9/104۔

ثوریؒ کا بھی نقل کیا ہے (۱) اور جمہور علماء اسلام کے نزدیک دین کے ساتھ نسب میں بھی کفاءت کا اعتبار ہے؛ لیکن نسباً کفاءت کا اعتبار عرب یعنی اولاد قحطان اور اولاد اسماعیل کے ساتھ مخصوص ہے، عجمی نسل کے لوگوں میں اس کفاءت کا مطلقاً اعتبار نہیں ہے۔ (۲)

دوسری جگہ ''سارے عجمی ایک دوسرے کے کفو ہیں'' کے بابت تحریر فرماتے ہیں :

نیز فقہ حنفی کے مسئلہ کفاءت کی رو سے ہر عجمی (جو کسی عربی قبیلہ کی طرف منسوب نہ ہو) دوسرے عجمی کا کفو ہے؛ لہٰذا راجپوت مسلمان، رائیں قوم، کنبوہ، رانکی (جو اپنے کو عراقی کہتے ہیں) پٹھانوں کی مختلف قسمیں، نعمانی برادری قدوائی، روتارے، مغل قوم اور ہر نو مسلم جس کا باپ اور دادا بھی مسلمان ہو سب آپس میں کفو ہیں؛ اس لئے کہ فقہاء حنفیہ نے تصریح کی ہے کہ غیر عربی برادریوں میں نسبی کفاءت کا اعتبار نہیں ہے۔ (۳)

ہندوستان میں جتنے خاندان ہیں عام طور سے ان کا نسب نامہ محفوظ نہیں ہے اس سلسلہ میں ہندوستانی شرفاء کے شجر ہائے نسب کے نام سے آپ نے طویل اور مدلل بحث فرمائی، وفاء الوفا، نزہۃ الخواطر، استاذ العلماء، اشرف السوانح، مرآۃ الانساب، تحفۃ الابرار، اُصول المقصود، طبقات ابن سعد اور زبدۃ المقامات وغیرہ کے حوالے ذکر کیے اور بعض انساب و کفاءت کے سلسلے میں دلائل سے ثابت کیا کہ اس خاندان کا نسب نامہ درست نہیں، چند مثالیں ملاحظہ ہوں :

1- حافظ ابن حجرؒ کے نامی شاگردوں میں تقی الدین قلقشندی بلند پایہ عالم ہیں، انھوں نے اپنے قریشی ہونے کا دعویٰ کیا تو ان کے معاصر امام بقاعی نے اس پر سخت قدح کی۔ (۴)

(۱) بدائع الصنائع:2/317۔

(۲) انساب و کفاءت کی شرعی حیثیت:۵۵-۵۶، ط:اول۔

(۳) انساب و کفاءت کی شرعی حیثیت:۵۵، ط:اول۔

(۴) الضوء اللامع:4/48۔

2- خلاصۃ الاثر اور سلک الدرر میں بہت سے علماء واعیان کو ابراہیم ادہم کی اولاد سے ذکر کیا ہے؛ حالاں کہ حضرت تھانوی دام ظلہ تصریح فرماتے ہیں کہ ابراہیم ادہم کی نسل نہیں چلی۔

3- محمد بن عطاء اللہ رازی ثم الہروی اپنے کو امام فخر الدین رازی کی اولاد سے بتاتے تھے، اسی طرح ہندوستان کے بعض صدیقی حضرات علماء بھی اپنا نسب نامہ امام موصوف سے ملاتے ہیں؛ حالاں کہ حافظ ابن حجر اور سخاوی جیسے ماہرین تاریخ ورجال تصریح فرماتے ہیں کہ ہم کو اس کی صحت کا ثبوت نہیں ملا، نہ کسی مؤرخ کا ہم نے یہ بیان پایا کہ امام رازی کی کوئی مذکر اولاد بھی تھی۔(۱)

غرض یہ پوری کتاب پڑھنے کے بعد انساب وکفاءت کا مسئلہ بالکل واضح ہوجاتا ہے اور خاص طور سے ہندوستان میں جو نسلی اور خاندانی تعصب کا ماحول ہے اگر اس کتاب کو تعصب کی چادر چاک کرکے پڑھا جائے تو انشاءاللہ سارا تعصب خاک ہوجائے گا، فقہی مسائل میں انساب وکفاءت کا مسئلہ ہر زمانہ میں بہت ہی معرکۃ الآرا اور مختلف فیہ رہا ہے، علامہ اعظمیؒ کی یہ تصنیف انساب وکفاءت کے سلسلے میں بہت ہی معتبر اور کافی وشافی ہے اور یہ آپ کی جلالت فقاہت ودیانت کی بین ثبوت ہے؛ دراصل یہ کتاب دو رسالوں کے رد میں لکھی گئی ہے جو اس موضوع (انساب وکفاءت) پر منظر عام پر آچکی تھیں اور اس سے ایک بڑے طبقہ کی دل شکنی ہوئی تھی اس وجہ سے اس کتاب میں بعض مقامات پر تلخی اور شدت کا غلبہ ہوگیا ہے۔

☆ مسئلہ رؤیت ہلال

مجلس تحقیقات شرعیہ کا ایک فیصلہ ''رویت ہلال'' کے سلسلہ میں ''قومی آواز'' مؤرخہ: ۱۱ مئی ۱۹۶۷ء میں شائع ہوا، جس پر علامہ اعظمیؒ کو مجموعی طور پر اتفاق نہ تھا، تو آپ نے اس سلسلہ میں یہ تحریر قلم بند فرمائی جو ''المآثر'' جلد: ۱۲، شمارہ: ۱، محرم صفر ربیع الاول ۱۴۲۴ھ میں شائع ہوئی جس کا خلاصہ پیش کرتے ہیں:

مجلس تحقیقات شرعیہ نے جو فیصلہ صادر کیا تھا وہ حضرت ابن عباسؓ کے فتاویٰ اور اجماع فقہا سے متصادم تھا اس لیے علامہ اعظمیؒ نے ان کو اس فیصلہ پر دوبارہ غور کرنے کا مشورہ دیا، مجلس نے ریڈیو سے رویت ہلال کے اعلان کو شہادت اصطلاحی مراد نہ لے کر ''خبر'' مانا ہے، اور اس طرح مجلس نے اعلان شائع کیا کہ:

(۱) ضوء لامع: 8/151، انساب وکفاءت کی شرعی حیثیت: ۷۹-۸۱، ط: اول۔

ریڈیو کا غیر مسلم ملازم بھی اگر کسی ذمہ دار ہلال کمیٹی یا جماعت علماء یا قاضی شریعت (بتصریح نام) کے فیصلہ کا اعلان کرے تو یہ خبر بھی قابل تسلیم ہوگی اورصوم وافطار صوم کا حکم درست ہوگا۔

حالاں کہ فقہاء احناف کی تصریحات کے مطابق ایسی خبر قطعاً قابل قبول نہیں، اس کے بعد فقہ حنفی کی مستند کتابوں سے بطور حوالہ کے مختلف عبارتیں تحریر فرمائی ہیں، علامہ اعظمیؒ نے ادلہ کو پیش کرنے کے بعد اس کا خلاصہ بیان فرمایا ہے کہ ادلہ شرعیہ کے اعتبار سے جو اُصول وضوابط شہادت شرعی کے لئے لازم ہیں ان کی پاسداری اس حکم نامہ میں نہیں ہو پارہی ہے، پھر اس کے بعد آپؒ نے آگے یہ بھی لکھا کہ بعض ترقی پسند لوگ بڑی آسانی سے احناف پر شدت پسندی کا لیبل لگا دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ دوسرے ائمہ کے یہاں نرمی اورتوسع ہے؛ حالاں کہ ایسا نہیں ہے، کہنے والے عدم واقفیت کا ثبوت دیتے ہیں، اس کے بعد آپؒ نے دوسرے ائمہ کے سرخیل علماء اور انھیں کی کتابوں سے عبارتیں بطور حوالہ کے پیش کی ہیں اور یہ ثابت کیا ہے کہ اگر یہ تشدد احناف کے یہاں ہے تو باقی مذاہب بھی اس تشدد سے قطعاً عاری نہیں ہیں، پھر اصل خلاصہ بیان کرتے ہوئے علامہ اعظمیؒ فرماتے ہیں: (۱) اب تک جو کچھ عرض کیا گیا اس کا حاصل یہ ہے کہ :

۱- مذاہب ائمہ کی رو سے جہاں رویت ہوئی ہے، وہاں اس کا ثبوت دیکھنے والوں کی شہادت سے ہوگا؛ اور جہاں رویت نہیں ہوئی ہے، وہ جگہ اگر دور ہے اور مقام رویت کے توابع ولواحق میں نہیں ہے، تو اگر اصل شاہدوں کی شہادت سن کر دو عادل مسلمان شہادت دیتے ہیں تو اس بعید جگہ میں بھی رویت کا ثبوت ہوجائے گا۔

۲- لیکن اگر شہادت سن کر شہادت نہ دیتے ہوں تو اگر چہ وہ رویت کا عام چرچا سن کر آئے ہوں، ان کے یہ کہنے سے کہ فلاں شہر میں چاند ہوگیا ہے اور وہاں عام طور پر لوگ روزہ سے ہیں، رویت کا ثبوت نہ ہوگا۔

۳- خبر اور حکایت ثبوت رویت کے لئے کافی نہیں ہے۔

(۱) مستفاد از: مقالات ابوالمآثر: ۲/ ۹۷-۱۰۷، ط: اول۔

اس کے بعد اس پورے مضمون میں علامہ اعظمیؒ نے مسئلہ رویت ہلال کو بہت واضح انداز میں ادلہ شرعیہ کی روشنی میں تحریر فرمایا ہے کہ جس سے آپ کی جلالت شان اور فقہ وفتاویٰ پر کس قدر آپ کی گہری نگاہ ہے اس کا پتہ چلتا ہے۔

☆ اسلامی پرسنل لا میں باب کفو

''المآثر'' میں یہ تحریر جلد: ۸، شمارہ: ۱، محرم صفر ربیع الاول ۱۴۲۰ھ میں شائع ہوئی، علامہ اعظمیؒ اس تحریر میں رقم طراز ہیں :

> مسلم پرسنل لا کی بنیادی کتابوں میں ہم کو ایک کفاءت کا باب (باب الاکفاء) بھی ملتا ہے، جس میں دین ومذہب کے علاوہ زوجین کا نسب اور پیشہ کی یکسانیت یا مماثلت کو بھی صحت نکاح کے لیے ضروری قرار دیا گیا ہے، اور اس میں اس حد تک شدت اختیار کی گئی ہے کہ اگر کسی عورت نے غیر کفو سے نکاح کر لیا، تو بعض فقہاء اس نکاح کو باطل اور کالعدم قرار دیتے ہیں ؛ چنانچہ مفتی عزیز الرحمٰن صاحب اپنے فتاویٰ میں فرماتے ہیں: ''نکاح مذکور جو کہ غیر کفو سے ہوا موافق روایۃ مفتی بہا کے صحیح نہیں ہوا؛ بلکہ باطل اور ناجائز ہوا''۔(۱)

اس روایت کے نسبت گزارش ہے کہ یہ امام ابوحنیفہؒ کا قول نہیں ہے ؛ بلکہ متأخر فقہاء کا قول ہے، جو دلائل کے خلاف ہونے کی وجہ سے ناقابل قبول ہے، کون نہیں جانتا کہ آنحضرت ﷺ نے حضرت زینب قرشیہ کا نکاح حضرت زید ابن حارثہؓ آزاد شدہ غلام سے کر دیا تھا، جو کفاءت کی فقہی تشریح کی رو سے حضرت زینبؓ کا کفو نہیں تھے، نفس کفاءت کے اعتبار وعدم اعتبار کے علاوہ اس کا جو معیار قرار دیا گیا ہے وہ بھی بڑی حد تک غور طلب ہے، مثلاً نسب کے لحاظ سے کفاءت کے اعتبار کے باب میں فقہاء کا یہ لکھنا کہ :

> اہل عجم میں کفاءت باعتبار نسب کے معتبر نہیں ہے ؛ بلکہ پیشہ وغیرہ کے اعلیٰ ادنیٰ ہونے پر مدار ہے۔(۲)

---

(۱) مقالات ابوالمآثر: ۲/ ۱۰۸، ط: اول۔

(۲) مستفاد فتاویٰ دارالعلوم دیوبند: ۸/ ۱۵۷-۱۷۰، کتاب النکاح، ط: ستمبر ۲۰۰۲ء، ناشر: دارالاشاعت، کراچی۔

کفاءت میں نسب کا اعتبار عرب میں ہے، اور عجم میں پیشہ وغیرہ کا اعتبار ہے، جو قومیں عجمی ہیں ان میں کفاءت معتبر نہیں ہے۔

اور عجمی کی تعریف یہ کی ہے کہ: ''جو کسی عربی قبیلہ کی طرف اپنی نسبت ظاہر نہ کرے''۔

اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ جو ہندوستانی لوگ اپنے کو صدیقی، فاروقی، عثمانی یا ایوبی وغیرہ کہتے ہیں ان کو بے تامل عربی یا قریشی مان لیا جاتا ہے، اور ان لوگوں کو ان کا کفو قرار نہیں دیا جاتا جو کسی عربی قبیلہ کی طرف اپنے کو منسوب نہیں کرتے، خلاصہ یہ کہ اگر کوئی بالغہ عورت جو نسباً صدیقی یا فاروقی وغیرہ ہو، کسی نعمانی یا افغانی یا قدوائی یا کمبوہ وغیرہ سے بلا اجازت ولی نکاح کرے، تو کفاءت نہ ہونے کی وجہ سے نکاح باطل ہوگا؛ حالاں کہ یہ بات صحیح حدیثوں کے سراسر خلاف ہے:

لَا فَضْلَ لِعَرَبِيٍّ عَلَى عَجَمِيٍّ وَلَا لِعَجَمِيٍّ عَلَى عَرَبِيٍّ إلا بالتقوی۔ (۱)

دوسری بات یہ ہے کہ عربی ہونے کے لئے صرف انتساب کا جو ذکر کیا گیا ہے، یعنی جو صدیقی یا فاروقی ہونے کا دعویٰ کردے وہ صدیقی اور فاروقی ہے، یہ سراسر تحکم اور بے انصافی ہے، کوئی دعویٰ بلا دلیل کے قابل تسلیم نہیں ہے اور ثبوت و دلیل کا یہ حال ہے کہ جو لوگ بھی اپنے کو صدیقی یا عربی النسل ہونے کے ثبوت میں شجرے پیش کرتے ہیں عموماً ان کے شجرے جھوٹے ہیں، اور جب شجرے جھوٹے ہیں تو ان کا عربی النسل ہونا باطل ہے؛ لہٰذا وہ بھی عجمی ہیں اور عجمی ان کا کفو ہے، بشرطیکہ دوسری کوئی دلیل وجہ کفاءت سے مانع نہ ہو۔

اس کے بعد علامہ اعظمیؒ نے ہندوستان میں پھیلے بہت سے خاندانوں کے سلسلہ میں اپنی تحقیق بیان فرمائی کہ یہ لوگ اپنے کو صدیقی، فاروقی وغیرہ لکھتے ہیں حالاں کہ اکثر لوگوں کی یہ نسبت جھوٹ پر مبنی ہے اس کے بعد آپؒ نے ان کی تاریخی اور تحقیقی پکڑ فرمائی ہے، پھر مسلم پرسنل لا کا جائزہ لینے والے علماء محققین کو مشورہ دیا کہ مسئلہ کفاءت پر قرآن و حدیث و فقہ کو سامنے رکھ کر از سر نو غور فرمائیں اور ان لغزشوں کی اصلاح کریں جو ہمارے ہندوستانی مفتیوں نے پھیلا رکھا ہے اور پھر علامہ اعظمیؒ نے مسئلہ کفاءت کا اعتبار کیوں کیا جاتا ہے اس کو واضح کیا ہے؛ مضمون کی اہمیت کے پیش نظر علامہ اعظمیؒ نے جن اُمور کی جانب نشاندہی کی ہے ان کو ہو بہو یہاں نقل کر دینا مناسب سمجھتے ہیں اس سے علامہ اعظمیؒ کا مقام و مرتبہ فقہ و فتاویٰ کے میدان میں کتنا بڑھا ہوا اور عظیم ہے، بخوبی اندازہ ہوگا:

(۱) مسند احمد، باب مسند الانصار، حدیث رجل من اصحاب النبی ﷺ، حدیث نمبر: ۲۳۴۸۹۔

۱- مثلاً کفاءت کا اعتبار اس وجہ سے کیا جاتا ہے: ''ولأن انتظام المصالح بين المتكافئين عادة''(۱) ''یعنی گھریلو مصالح کا منظم ہونا برابری کے جوڑوں میں عادۃً ممکن ہے''۔

تو عورت کی جانب سے بھی کفاءت کا اعتبار ہونا چاہئے کہ تکافؤ یعنی دونوں جانب سے برابری کا تحقق اسی وقت ہوگا، نیز جب یہ بات ایک حقیقت تسلیم کر لی جائے گی کہ شوہر شریف اور عورت رذیل ہے، تو عورت ہمیشہ اس رنج وکوفت میں مبتلا رہے گی کہ شوہر مجھ کو رذیل اور کمین تصور کرتا ہے، اور وہ میری عزت نہیں کرتا اور بیوی کی حیثیت سے میں جس احترام کی مستحق ہوں اس میں کوتاہی کرتا ہے، تو ایسی حالت میں مصالح کا انتظام کیوں کر ممکن ہے۔

۲- جب یہ حقیقت ہے کہ دین وتقویٰ کے علاوہ شرافت ورذالت کا ہر معیار خیالی اور عرفی ہے، تو جس صورت میں مرد وعورت دونوں اس خیالی معیار کو غلط سمجھتے ہوں، اور اس کو نظر انداز کر کے نکاح پر آمادہ ہوں اور نکاح کر لیں، تو اس کو صحیح اور منعقد قرار دیا جائے، ولی کی رضامندی کی شرط نہ لگانی چاہئے؛ بلکہ ولی کو حکم دینا چاہئے کہ وہ عورت کی خواہش کی موافقت کرے؛ کیوں کہ وہ ایک غلط ذہنیت کو عملاً مٹانے کے لیے آمادہ ہوئی ہے۔

۳- جب یہ واقعہ ہے کہ امام ابوحنیفہ کا اصل مذہب یہ ہے کہ غیر کفو میں نکاح صحیح اور منعقد ہوجاتا ہے؛ لیکن ولی کو فسخ کرانے کا اختیار باقی رہتا ہے، اور یہی روح شریعت کے مطابق بھی ہے: ''لَا فَضْلَ لِعَرَبِيٍّ عَلَى عَجَمِيٍّ وَلَا لِعَجَمِيٍّ عَلَى عَرَبِيٍّ إلا بالتقوى''(۲) تو متاخرین کی رائے پر فتویٰ دینا صحیح نہیں ہے، اس لئے کہ وہ رائے اسی خیالی اونچ نیچ کے تصور پر مبنی ہے جو روح شریعت کے منافی ہے۔

۴- جب فقہائے محققین نے بہت شدومد کے ساتھ لکھا ہے کہ شرفِ علم شرفِ نسب پر فوقیت رکھتا ہے، اور ایک عالم دین سیدہ کا کفو ہوسکتا ہے، تو اس پر فتویٰ دینے میں پس وپیش کیوں ہے؟ حالاں کہ اس پس وپیش سے سنت مطہرہ کی صریح خلاف ورزی ہوتی ہے۔

کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ سید اولاد آدم حضرت محمد رسول اللہ ﷺ نے اپنی پھوپھی زاد بہن زینب کا نکاح اپنے آزاد کردہ غلام زید سے کر دیا تھا؛ حالاں کہ سماج میں اونچ نیچ کا جو تصور پایا جاتا تھا اس کی بنا پر

(۱) الہدایہ: ۱/ ۱۹۵، فصل فی الکفاءۃ، ناشر: دار احیاء التراث العربی، بیروت لبنان۔

(۲) مسند احمد، باب مسند الانصار، حدیث رجل من اصحاب النبی ﷺ، حدیث نمبر: ۲۳۴۸۹۔

حضرت زینب ابتداءاً آمادہ نہ تھیں، مگر آنحضرت ﷺ کو یہ عرفی تفریق مٹانی تھی اور اس غلط خیال کو دماغوں سے نکالنا تھا، اس زینب کو جو عرفی شرافت کے اعلیٰ مقام پر فائز تھیں، حضرت زید کے نکاح میں دے دیا، جو جاہلی اور عرفی نقطۂ نظر سے بہت ہی پست اور ادنیٰ درجہ کے تھے؛ اسی طرح حضرت مقدادؓ بن اسود جو اصلاً بہرانی یا کندی تھے، قریش سے دور کا واسطہ بھی نہ تھا (اور کندہ کے لوگ بافندگی کا پیشہ کرتے تھے) ان کا نکاح آنحضرت ﷺ نے اپنی چچازاد بہن ضباعہ سے کر دیا تھا، قصہ یہ پیش آیا تھا کہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف جو قریش اور عشرہ مبشرہ میں سے تھے اور مقدادؓ کہیں بیٹھے ہوئے تھے، حضرت عبدالرحمٰن نے باتوں باتوں میں مقداد سے کہا کہ تم نکاح کیوں نہیں کر لیتے؟ مقدادؓ نے کہا کہ پھر آپ اپنی لڑکی سے میرا نکاح کیوں نہیں کر دیجئے، اس پر عبدالرحمٰن برہم ہو گئے اور ان کو بہت سخت وسست کہ ڈالا، حضرت مقدادؓ نے آنحضرت ﷺ سے اس کی شکایت کی، سرکار ﷺ نے فرمایا اچھا میں تمہارا نکاح کیے دیتا ہوں؛ چنانچہ آپ ﷺ نے اپنی چچازاد بہن سے ان کا نکاح کر دیا، آنحضرت ﷺ کی اسی سنت پر عمل پیرا ہو کر قرن اول کے مسلمانوں نے حضرت بلال حبشیؓ غیر عربی اور حضرت سلمان فارسیؓ کا نکاح عربی عورتوں سے یکے بعد دیگرے پڑھوایا اور اس اُصول کو تسلیم نہیں کیا کہ عرب عورت کا کفو عجمی مرد نہیں ہو سکتا۔

۵- پیشہ کو بنیاد کفاءت قرار دینے کی صورت میں اس بات کو صاف کرنا ضروری ہے کہ جو آدمی مثلاً خود حجامی کرتا ہے وہی حجام ہے؟ یا جس کا باپ یا دادا یا پردادا حجامی کرتا تھا مگر یہ مثلاً اسکول کی ماسٹری کرتا ہے تو یہ بھی حجام کہلائے گا؟ یا ایک آدمی کی پانچ پشت اوپر کے لوگ کپڑا بنتے تھے، مگر چار پشت سے اس کے خاندان کے لوگ بافندگی چھوڑ کر کاشتکاری، بزازی، مدرسی، ماسٹری، کلرکی، وکالت یا منصفی یا ججی کرتے ہیں تو کیا یہ سب بافندہ شمار ہوں گے؟ اگر جواب اثبات میں ہے، اور پیشے کی دناءت ایسا متعدی مرض ہے کہ پشتہا پشت تک اس کا اثر نہیں جاتا، اور چھوڑنے کے بعد بھی رذالت کا داغ نہیں مٹتا، تو پھر ان ہزاروں سیدوں، صدیقیوں، فاروقیوں اور پٹھانوں کو بھی رذیل شمار کرنا چاہئے جو خود یہ پیشہ کرتے ہیں اور ان کو ان کی ہی برادری کے ان اشخاص کا کفو نہ ہونا چاہئے جو یہ پیشہ نہیں کرتے، اور ان کا آپس میں نکاح صحیح نہ ہونا چاہئے، اگر کہا جائے کہ صدیقی، فاروقی وغیرہ چوں کہ صاحب نسب ہیں، اس لئے وہ ذلیل سے ذلیل پیشہ بھی اختیار کریں تو پیشہ کی وجہ سے ان میں رذالت پیدا نہ ہو گی تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ پھر کوئی پیشہ نہ ذلیل ہے نہ اس سے رذالت پیدا ہوتی ہے، اصل چیز نسب ہے، نسب ہو تو کوئی پیشہ ذلیل نہیں، نسب نہ ہو تو بہت سے پیشے رذالت کا سبب بنتے ہیں، کیا یہ منطق صحیح ہے؟

کیا یہ کوئی شرعی نظریہ قرار دیا جاسکتا ہے؟ کیا اس پر کسی اسلامی قانون کی بنیاد رکھی جاسکتی ہے؟ ہرگز نہیں؛ یہی وجہ ہے کہ شامی وغیرہ میں مصرح ہے کہ پیشہ کے لحاظ سے کفاءت جس طرح عجمیوں میں معتبر ہے اسی طرح عربوں میں بھی معتبر ہے: ''**وحینئذٍ فتکون معتبرۃ بین العرب والعجم**''۔(۱)

۶- اسی طرح یہ جومشہور ہے کہ عجمی اگر عالم بھی ہوتو عربیہ کا کفونہیں ہوگا، یہی ظاہرالروایۃ ہے، تو یہ بالکل غلط ہے، اور ظاہرالروایۃ ہونے کا دعویٰ بالکل بے دلیل ہے اور محیط و بزازیہ وفیض و جامع الفتاویٰ وغیرہ میں جزم ویقین کے ساتھ مذکور ہے کہ شرف علم شرف نسب سے بڑھ کر ہے، ایسا ہی صاحب نہر فائق نے بھی لکھا ہے، اور اسی کو کمال ابن الہمام نے پسند کیا ہے؛ لہٰذا کوئی عجمی عالم خواہ وہ خیاط ہو یا بزاز یا تاجر یا بافندہ، ایک سیدانی کا بلاشبہ کفو ہے، اور سید اولاد آدم حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کا عمل اس کی دلیل ہے۔(۲)

☆ دیوبندیوں سے چندسوالات کاجواب

علامہ اعظمیؒ کی یہ تحریر ۱۳۴۷ھ کے بعد کی ہے،(۳) اس میں مولوی یوسف فیض آبادی کے سوالات کے جوابات دیے گئے ہیں، یہ سوالات واعتراضات ویسے ہی ہیں جو کہ رضاخانی عام طور پر دیوبندیوں سے کرتے ہیں، علامہ اعظمیؒ نے نہایت ہی چشم کشا اور بصیرت آمیز انداز میں ان کا جواب دیا ہے، سوالات ایمان کے گھٹنے بڑھنے کے متعلق، صحابہ کو گالی دینے کے سلسلے میں کہ اس سے مسلمان کافر ہوگا یا نہیں، کتے اور خنزیر کے نجس العین ہونے اور نہ ہونے کے سلسلے میں، جلق (مشت زنی) کے بارے میں اور اُجرت دے کر زنا کرنے وغیرہ کے متعلق ہیں، یہ تقریباً 12 / سوالات ہیں، علامہ اعظمیؒ نے ان سب کا بہت مختصر اور جامع جواب تحریر فرمایا ہے، جس میں سے چند کو مختصراً یہاں استفادہ کی غرض سے ہم ذکر کررہے ہیں:

ایمان کے ترقی وتنزلی کے تعلق سے جو سوال ہے تو اس کے جواب میں علامہ اعظمیؒ نے فرمایا کہ زیادۃ ونقص ایمان اختلافی مسئلہ ہے، اور یہ اختلاف نہایت قدیمی ہے، اور اس اختلاف کے متعلق محققین کی رائے ہے کہ لفظی ہے، یعنی جو شخص اس کے گھٹنے بڑھنے کا قائل ہے وہ ایمان کی اور تعریف کرتا ہے اور جو اس کا قائل نہیں ہے وہ ایمان کی اور تعریف کرتا ہے؛ اس کے بعد آپؒ ملاعلی قاریؒ کے ذکر کردہ ایمان کی تصریح کو ذکر کرنے

(۱) ردالمحتار: ۳/ ۹۰، باب الکفاءۃ، ط: الثانیہ، ناشر: دارالفکر، بیروت۔

(۲) مستفاد از: مقالات ابوالمآثر: ۱/ ۱۰۸-۱۱۵، ط: اول۔

(۳) مقالات ابوالمآثر: ۱/ ۱۶، ط: اول۔

کے بعد پھر فرماتے ہیں کہ خلاصہ کلام یہ ہے کہ ہمارا اور جملہ محققین کا مسلک یہ ہے کہ نفس تصدیق کے لحاظ سے کمی وبیشی متصور نہیں ہاں کیفیت کے لحاظ سے کمی وبیشی ممکن؛ بلکہ واقع ہے اور زیادت ونقص جو نصوص میں وارد ہیں ان سے قوت وضعف مراد ہے، اس کے بعد علامہ اعظمیؒ نے ملاعلی قاریؒ کی ایک عبارت بطور حوالہ ذکر کرنے کے بعد فرمایا کہ بہر حال زیادۃ ونقصان بمعنی قوت وضعف ایمان کے ہم قائل ہیں اور اسی پر نصوص کو محمول کرتے ہیں، رہا زیادت ونقصان بمعنی تفاوت فی الکمیۃ اس کے قائل نہیں؛ اس لئے نہ عقائد نسفی کے جواب کی ضرورت ہے نہ نصوص کی مخالفت لازم آتی ہے، ہاں یہ واضح رہے کہ زیادت ونقصان ان دونوں کا فرق سمجھنے کے لئے علم شرط ہے سرسری طور پر مطالعہ کتب کافی نہیں ہے۔

صحابہؓ کو گالی دینے سے کافر ہونے اور نہ ہونے کے سلسلے میں جو استفسار ہے، اس کے جواب میں علامہ اعظمیؒ کچھ یوں رقم طراز ہیں کہ صحابہؓ کو گالی دینا یا بغض رکھنا اہل سنت میں کسی کے نزدیک بھی کفر نہیں، اہل سنت کے نزدیک گالی موجب کفر نہیں ہوتی؛ اس کے بعد آپؒ نے حافظ ابن حجرؒ کی ایک عبارت بطور دلیل کے پیش کی اس کے بعد فرماتے ہیں کہ معلوم ہوا کہ مطلق بغض کفر نہیں ہے اگر چہ گناہ اور سخت گناہ ہے اور حنفیہ کرام بھی اسی کے قائل ہیں کہ صحابیوں سے بغض رکھنا اگر چہ سخت ترین گناہ ہے؛ لیکن کفر نہیں ہے، ہاں اگر اس خیال سے بغض رکھے کہ انھوں نے رسول ﷺ کی مدد کی تو بے شک نفاق ہے، اب ہم ذرا مولوی یوسف صاحب سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ حدیث بخاری: ''سباب المسلم فسوق'' (مسلمان کو گالی دینا فسق ہے)۔(۱)

میں گالی کو فسق کہا گیا ہے، اگر سبِّ صحابہ کو آپ کفر سمجھتے ہیں تو حدیث صحیح کے خلاف ہے یا نہیں۔

دوسری بات یہ کہ قتال مسلم کو کفر کہا گیا ہے: ''وقتاله کفر'' (مسلمان سے قتال کرنا کفر ہے)۔(۲)

پس صحابہ میں جو قتال ہوا ہے اس کی بابت کیا فتویٰ ہے اور نیز قتال کرنے والے مومنوں کو امام بخاری قرآن سے مومن ثابت کرتے ہیں اور وہی وقتالہ کفر بھی روایت کرتے ہیں ان کی بابت کیا رائے ہے، نیز یہ کہ قتال مومن بنص قرآنی (کمازعم البخاری) منافی ایمان نہیں ہے تو سبِ مومن کیوں کر کافر ہو جاوے گا۔

کتے کے نجس العین ہونے اور نہ ہونے کے سلسلے میں جو استفسار ہے تو اس کے جواب میں علامہ اعظمیؒ فرماتے ہیں کہ افسوس کہ آپ کو بخاری کے باب سور الکلاب وممرھا فی المسجد سے بھی ذہول ہو گیا ہے اور اگر اس

(۱) صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب سباب المسلم فسوق، حدیث نمبر: ۶۴۔

(۲) سنن ترمذی، ابواب الایمان، باب ماجاء سباب المسلم، حدیث نمبر: ۲۶۳۵۔

باب کو آپ پڑھیے اور سمجھنے کی کوشش کیجئے تو معلوم ہوگا کہ امام بخاریؒ کے نزدیک صرف یہی نہیں کتا نجس العین نہیں ہے؛ بلکہ مطلقاً نجس نہیں ہے؛ چنانچہ امام زہریؒ کا فتویٰ نقل کیا ہے کہ اگر کوئی دوسرا پانی موجود نہ ہوتو اسی پانی سے وضو جائز ہے جس میں کتے نے پیا ہو، اس مقام پر حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں :

والظاهر من تصرف المصنف انه يقول بطهارته ۔ (۱)

یعنی مصنفؒ کے تصرف سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس کی پاکی کے قائل ہیں۔

خنزیر کے نجس العین ہونے اور نہ ہونے کی بابت جو سوال ہے جس میں یہ الزام لگایا گیا ہے کہ امام صاحب کے نزدیک یہ نجس العین نہیں ہے تو علامہ اعظمیؒ اس کے جواب میں فرماتے ہیں کہ بالکل جھوٹ ہے، افترا ہے، بہتان ہے، درمختار کا حوالہ بھی غلط ہے؛ بلکہ اس کے خلاف خنزیر کا نجس العین ہونا اس میں مصرح ہے؛ چنانچہ درمختار میں صاف ہے لنجاستہ عینہ اس کے بعد شامی کی بھی ایک عبارت کا حوالہ ذکر کرنے کے بعد علامہ اعظمیؒ نے فرمایا کہ آپ نے درمختار کے جس مقام کا حوالہ دیا ہے اس کو نہ آپ نے سمجھا ہے نہ اس نے جس کی تقلید میں آپ نے لکھ مارا ہے، اس کے بعد آپؒ نے درمختار کی پوری عبارت ذکر کرنے کے بعد فرمایا کہ صاحب درمختار نے قہستانی کے اس قول کو کہ خنزیر امام صاحب کے نزدیک نجس العین نہیں تو اور کیا ہے مگر آپ حضرات نے خوش فہمی سے اُلٹی بات سمجھی، مولوی صاحب انصاف کیجئے کہ ایسی سمجھ سے قرآن وحدیث سے استخراج احکام واستنباط کیجئے گا :

اس سادگی پہ کون نہ مرجائے اے خدا
لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

جلق کے سلسلے میں جو سوال ہے جس میں یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ حنفی مذہب کی بڑی معتبر کتاب شامی میں جلق کا واجب ہونا ملاحظہ فرمایئے: خوف زنا ہو تو جلق لگانا واجب ہے، اس کے جواب میں علامہ اعظمیؒ تحریر فرماتے ہیں کہ جلق کو ہمارے علماء نے بتصریح حرام لکھا ہے؛ چنانچہ درمختار میں لکھا ہے کہ: ''**الاستمناء حرام ، وفيه التعزير** ''(یعنی جلق لگانا حرام ہے اور اس پر سزا دی جاوے گی)۔(۲)

باقی جو کچھ آپ نے شامی سے نقل کیا ہے وہ قابل اعتراض چیز نہیں ہے، آپ خود بتایئے کہ ایک غیر شادی شدہ شخص شہوت سے مجبور ہے اور اندیشہ ہے کہ زنا میں مبتلا ہوجاوے گا تو اس حالت میں زنا کر لینا

---

(۱) فتح:۱/۱۹۱۔

(۲) ردالمحتار: ۴/۲۷، باب الوطء الذی یوجب الحد والذی لا یوجبہ، ط: ثانی۔

ٹھیک ہے یا جلق سے دفع شہوت کر لینا، امام شامی کی یہی مراد ہے کہ اگر جلق نہیں لگا تا تو بلا زنا کئے نہیں رہ سکتا تو جلق لگائے نہ کہ زنا کرے اور جلق کو زنا پر ترجیح دے، اس لئے کہ زنا کی حرمت نص قطعی سے بصراحت ثابت ہے، کیا آپ کی رائے ہے کی زنا کرے، علامہ شامی پر تو معترض ہو گئے ؛لیکن یہ نہ سوچا کہ بڑے بڑے جغادری اہل حدیث جو آپ سے کہیں زیادہ قرآن وحدیث سے واقف تھے کیا لکھ گئے ہیں، سنئے ! مولوی نورالحسن صاحب خلف الصدق جناب نواب صدیق حسن خان صاحب عرف الجادی میں لکھتے ہیں : مشت زنی (جلق لگانا) یا کسی چیز سے منی نکالنا اس شخص کے لئے جس کی بیوی نہ ہو مباح ہے اور اگر گناہ میں مبتلا ہونے کا خوف ہو تو واجب ہے یا مستحب ہے اور مولوی وحید الزماں صاحب غیر مقلد نے نزل الابرار میں ہر حالت میں جلق کو جائز لکھا ہے۔

اس مضمون کے اختتامیہ میں علامہ اعظمیؒ تحریر فرماتے ہوئے لکھتے ہیں کہ میں نے ان سوالات کے جوابات میں حتی الامکان اختصار سے کام لیا ہے اس لئے کہ اکثر سوالات کے جوابات بارہا آ چکے ہیں، ان میں سے کتنے سواالات کے جوابات تو میں خود کئی بار لکھ چکا ہوں اور بہتیرے سوالات کا جواب دوسرے علماء حنفیہ نے دیئے ہیں اور العدل میں یا متفرق رسائل میں شائع ہو چکے ہیں، اس لئے بار بار ان سوالات کو دہرانا عقلمندی کے خلاف ہے، کام کی بات یہ ہے کہ ان جوابات پر غائر نظر ڈال کر کے اگر کلام کی گنجائش ہو تو کلام کیا جاوے مگر میں دیکھتا ہوں کہ یہ کسی سے نہیں ہوتا اور انشاء اللہ نہیں ہوگا، آپ خود دیکھ لیجئے گا کہ مولوی یوسف صاحب ہمارے جوابات پڑھ کر کسی بہانہ سے یا تو خاموشی اختیار کر لیں گے یا اپنے خاص لہجے میں صلواتیں سنانے لگیں گے یا پھر کوئی اشتہار شائع کر کے سائل بن جائیں گے ؛ آخر میں مولوی یوسف صاحب سے اتنی گزارش ہے کہ اگر آپ عالمانہ طور پر میرے جوابات کے متعلق کچھ لکھیں تو مہربانی کر کے اس کے مطالعہ کا مجھ کو بھی موقع دیں۔

ان سوالات کے جس قدر علامہ اعظمیؒ نے مختصر اور جامع جوابات دیئے ہیں اس سے آپ کی فقہی فہم وفراست اور جلالت شان کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ آپؒ محدث جلیل کے ساتھ ساتھ فقیہ دوراں بھی تھے اور فقہ وفتاویٰ پر آپؒ کی گہری نظر بھی تھی۔

☆ تحقیق حکم الطلقات الثلاث

جب دارالعلوم مئو میں آپؒ مسند درس وتدریس پر جلوہ افروز تھے اسی دورانیہ میں غیر مقلدین علماء کی نظروں سے گزر کر آپؒ کے پاس ایک استفتاء آیا کہ ایک آدمی نے اپنی بیوی کو تین طلاق دے دی تو ایک واقع

ہوگی یا تین؟ آپؒ نے تین کے وقوع پر نہایت ہی مدلل اور مبرہن جواب دیا تھا آپ کا مذکورہ فتویٰ ۲۲ر جمادی الثانی ۱۳۴۱ھ کا تحریر فرمودہ ہے،(۱) دور حاضر میں اس مسئلہ تین طلاق کی اہمیت اور شہرت کچھ زیادہ ہوچکی ہے؛ لہٰذا بہتر معلوم ہوا کہ علامہ اعظمیؒ کے فتویٰ کو یہاں پیش کیا جائے؛ اول سوال و جواب پھر اس پر علامہ اعظمیؒ نے جو جواب لکھا اس کو مختصراً پیش کرتے ہیں :

فتویٰ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ زید نے اپنی عورت کو تین طلاق بائن مغلظہ ایک مجلس میں دیا، اب زید کی عورت پھر زید کے یہاں آئی ہے اور زید کے یہاں رہنا چاہتی ہے اور زید بھی رکھنا چاہتا ہے بشرطیکہ عند الشرع جائز ہو، پس سوال یہ ہے کہ کیا ایسی طلاق کے بعد رجعت ہوسکتی ہے اور زید عورت کو رکھ سکتا ہے، بینوا وتوجروا۔

الجواب

صورتِ مسئولہ میں واضح ہو کہ زید نے چوں کہ ایک ہی جلسہ میں اپنی عورت کو تینوں طلاقیں دی ہے اس لئے وہ تینوں ایک ہی طلاق کے شمار میں ہے پس رجعت جائز ہے، نسائی شریف جلد: ۲ صفحہ ۸۲ میں ہے :

ان أبا الصهباء جاء إلى ابن عباس فقال يا ابن عباس الم تعلم أن الثلاث كانت على عهد رسول الله صلى الله عليه وسلم وأبي بكر وصدراً من خلافة عمرَ رضى الله عنهما تُرَد الى الواحدةِ قال : نعم ۔

اور اسی طرح مسلم شریف اور دیگر کتب حدیث میں ہے، خلاصہ یہ کہ صورت مسئولہ میں رجعت جائز ہے، واللہ اعلم۔

(حررہ ابوالنعمان محمد عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ)

الجواب صحیح محمد احمد عفی عنہ

ذیل میں ہم علامہ اعظمیؒ کے جواب کو مختصراً پیش کررہے ملاحظہ فرمائیں، آپؒ فرماتے ہیں: جواب مذکورہ دو وجہ سے صحیح نہیں، اولاً زید نے تین بائن طلاقیں دی ہیں، اگر تینوں ایک ہی طلاق کے شمار میں ہوں تو بھی رجعت

(۱) مقالات ابوالمآثر: ۱/ ۱۹، ط: اول۔

نہیں کرسکتا؛ کیوں کہ ایک بھی بائن ہوگی اور طلاق بائن کے بعد اختیار رجعت نہیں رہتا، ثانیاً ائمہ اربعہ بلکہ جمہور ائمہ مسلمین کا اجماع ہے کہ تین طلاقیں اگر دفعتاً واقع کردی جائیں تو تینوں واقع ہوجاتی ہیں؛ اس کے بعد علامہ اعظمیؒ اپنے مذکورہ بالا قول کی دلیل میں امام نووی، شیخ ابن الہمام، امام مسلم اور امام بخاری کی آراء بطور دلیل ذکر فرمانے کے بعد رقم طراز ہیں کہ :

> صحابہ میں امیر المؤمنین حضرت عمر بن الخطابؓ، عثمان ذی النورینؓ، علیؓ کرم اللہ وجہہ اور حبر الامۃ ترجمان القرآن عبداللہ بن عباسؓ، عبداللہ بن عمرؓ، عبداللہ بن مسعودؓ، عبداللہ بن عمر بن عاصؓ اور ابوہریرہؓ اسی کے قائل ہیں، اور سب سے بڑھ کر تو یہ کہ خلیفہ ثانی حضرت فاروق اعظمؓ کے زمانہ خلافت میں تمام صحابہ کا اس پر اجماع ہوچکا ہے۔

اس کے بعد علامہ اعظمیؒ نے فرمایا کہ ان باتوں کے ہوتے ہوئے چنداں ضرورت نہ تھی کہ ہم اپنے دلائل حدیث سے بھی پیش کریں؛ لیکن پھر بھی ہم حدیث سے بھی دلائل پیش کررہے ہیں پھر آپؒ نے سات احادیث تین طلاق کے دلائل میں پیش فرمائی ہیں، ہم یہاں دو احادیث ذکر کررہے ہیں ملاحظہ ہو :

> حَدَّثَنِي مُحَمَّدُ بْنُ بَشَّارٍ ، حَدَّثَنَا يَحْيَى ، عَنْ عُبَيْدِ اللهِ ، قَالَ : حَدَّثَنِي الْقَاسِمُ بْنُ مُحَمَّدٍ ، عَنْ عَائِشَةَ ، اَنَّ رَجُلًا طَلَّقَ امْرَاَتَهُ ثَلَاثًا ، فَتَزَوَّجَتْ فَطَلَّقَ ، فَسُئِلَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ : اَتَحِلُّ لِلْاَوَّلِ ؟ قَالَ : ''لَا ، حَتَّى يَذُوقَ عُسَيْلَتَهَا كَمَا ذَاقَ الْاَوَّلُ'' ۔ (۱)
>
> حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دیں، اس عورت نے دوسرا نکاح کرلیا، دوسرے شوہر نے بھی طلاق دے دی، رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا کہ کیا وہ پہلے شوہر مرد کے لیے حلال ہوگئی؟ آپ نے فرمایا نہیں جب تک کہ دوسرا شوہر پہلے شوہر کی طرح لطف اندوز نہ ہولے۔

دوسری حدیث جو علامہ اعظمیؒ نے بطور دلیل رقم کی ہے ہم مکمل حدیث استفادہ کی غرض سے پیش کر رہے ہیں اور ترجمہ اتنا ہی پیش کررہے ہے جتنا آپؒ نے ذکر کیا ہے :

(۱) صحیح بخاری، کتاب الطلاق، باب من أجاز طلاق الثلاث، حدیث نمبر: ۵۲۶۱۔

أَخْبَرَنا اَبُوْ عَبْدِ اللهِ الحافِظُ ، واَبُوْ بَكْرٍ أَحْمَدُ بْنُ الحَسَنِ ، قالا: ثنا أَبُوْ العَبّاسِ مُحَمَّدُ بْنُ يَعْقُوبَ ، ثنا أَبُوْ اُمَيَّةَ الطَّرَسُوسِيُّ ، ثنا مُعَلّى بْنُ مَنصُورٍ الرّازِيُّ ، ثنا شُعَيْبُ بْنُ رُزَيْقٍ ، أَنَّ عَطاءً الخُراسانِيَّ ، حَدَّثَهُمْ عَنِ الحَسَنِ ، قالَ : حَدَّثَنا عَبْدُ اللهِ بْنُ عُمَرَ ، أَنَّهُ طَلَّقَ امْرَأَتَهُ تَطْلِيقَةً وهِيَ حائِضٌ ، ثُمَّ أَرادَ أَنْ يُتْبِعَها بِتَطْلِيقَتَيْنِ اُخْراوَيْنِ عِنْدَ القُرْئَيْنِ الباقِيَيْنِ ، فَبَلَغَ ذَلِكَ رَسُولَ اللهِ صلى الله عليه وسلم فَقالَ : يا ابْنَ عُمَرَ ''ما هَكَذا أَمَرَكَ اللهُ إِنَّكَ قَدْ أَخْطَأْتَ السُّنَّةَ ، والسُّنَّةُ أَنْ تَسْتَقْبِلَ الطُّهْرَ فَتُطَلِّقَ لِكُلِّ قُرْءٍ'' قالَ : فَأَمَرَنِي رَسُوْلُ اللهِ صلى الله عليه وسلم فَراجَعْتُها ثُمَّ قالَ : ''إذا هِيَ طَهُرَتْ فَطَلِّقْ عِنْدَ ذَلِكَ أَوْ أَمْسِكْ'' فَقُلْتُ : يا رَسُولَ اللهِ ، أَفَرَأَيْتَ لَوْ أَنِّي طَلَّقْتُها ثَلاثًا كانَ يَحِلُّ لِي أَنْ اُراجِعَها ؟ قالَ لِي : ''لَوْ كانَتْ تَبِينُ مِنكَ فَتَكُونُ مَعْصِيَةً'' ۔ (۱)

حضرت ابن عمرؓ نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! آپ کا کیا خیال ہے اگر میں اس کو تین طلاق دے دیتا تو کیا میرے لیے اس سے رجعت کرنا جائز ہوتا؟ آپ ﷺ نے فرمایا: نہیں، وہ تم سے بائن ہوجاتی اور ایسا کرنا گناہ ہوتا۔

ساری احادیث ذکر کرنے کے بعد علامہ اعظمیؒ اس کا حاصل نتیجہ بتاتے ہوئے حدیثوں کے ضعف وقوت پر بھی بحث فرماتے ہیں اس کے بعد آپؒ فرماتے ہیں کہ :

متفق علیہ حدیث عائشہ استدلال کے لیے کافی ہے، بالخصوص جب کہ آثار صحابہ اس کی تائید میں بکثرت مروی ہیں ؛ چنانچہ ابن عمر کا اثر ''فإن طلقها ثلاثاً حرمت علیک حتی تنکح زوجاً غیرہ'' بخاری ومسلم میں ہے، اور دیگر آثار سنن اربعہ، دارقطنی، شرح معانی الآثار طحاوی، فتح القدیر میں مذکور ہیں ان کی مراجعت کر لی جائے۔

---

(۱) السنن الصغیر للبیہقی: ۲/ ۱۱۵، حدیث نمبر: ۲٦٦٤۔

پھر علامہ اعظمیؒ نے اجماع صحابہ کے متعلق حافظ فتح الباریؒ کی عبارت بطور دلیل پیش فرمانے کے بعد مجیب نے جو حدیث جواب میں ذکر کی ہے اس حدیث کی صحت پر آپؒ نے سیر حاصل بحث فرمائی، پھر پوری بحث کا خلاصہ ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

تقریر استدلال یہ ہے کہ طلاق دینے والا کبھی اپنی کئے پر پشیمان ہوتا ہے، مگر بی بی کے حرام ہوجانے کی وجہ سے مراجعت نہیں کرسکتا، اور اگر وقوع ثلث کے بعد پھر رجعت ہوسکے تو ندامت کیوں ہوتی، پس وپیش کیوں ہوتا۔

اس کے بعد آپؒ نے امام نوویؒ کی عبارت مذکورہ بالا بات کی دلیل میں پیش فرمانے کے بعد کہتے ہیں :

ایک دلیل یہ بھی ہے رکانہ نے جب بتہ طلاق دی تو آپ نے قسم کھلا کر پوچھا: ''آللہ ما أردت إلا واحدة'' تو انھوں نے کہا: ''آللہ ما أردت إلا واحدة'' اس سے معلوم ہوا ثلاث بھی دفعتاً واقع ہوجاتی ہے، اس لئے اگر تین کے ارادہ کی صورت میں بھی ایک ہی واقع ہوتی تو قسم کھلا کر پوچھنے کی کیا ضرورت؟ جب دونوں صورتوں کا ایک ہی حکم تھا تو حلف دے کر ایک کی تعین کرانے کی کیا غرض: ''ھذا ما تحقق عندی فی المسئلۃ وفیہ کفایۃ لمن لہ أدنی درایۃ واللہ اعلم وعلمہ اتم۔

حافظ وظیفہ تو دُعا گفتن است و بس
درآں مباش کہ نشنید یا شنید

کتبہ ابو المآثر حبیب الرحمٰن الاعظمی غفرلہ

مدرس دار العلوم، مئو

۲۲ر جمادی الثانیہ ۱۳۴۱ھ

علامہ اعظمیؒ کا جواب اور ان کی دلیلوں کے دیکھنے کے بعد ہر صاحب نظر بخوبی آپؒ کے علمی مقام سے واقف ہوسکتا ہے، اور حدیث کے ساتھ فقہ ق فتاویٰ پر آپ کی نگاہ کتنی گہری ہے اس کا بھی کما حقہ احساس کرسکتا ہے۔

• • •

حضرت مولانا شاہ عبد الرحیم مجددیؒ
زمانہ شناس عالم اور دردمند مصلح

خالد سیف اللہ رحمانی

اللہ تبارک وتعالیٰ نے اسلام کی مشعل روشن فرما کر قیامت تک کے انسانوں کی ہدایت کو اسی کی روشنی اور رہنمائی سے وابستہ کر دیا ہے، ہر زمانے میں اس کی روشنی وضیا پاشی برقرار رہے، اس کی چمک دمک قائم رہے، اس کا رنگ وروپ نکھرا رہے اور اس کی تابانی اور توانائی دونوں میں کوئی فرق نہ آئے، اس کے لئے رسول اللہ ﷺ نے اہل علم کی ذمہ داری کی طرف ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے کہ دین کے صاف شفاف سرچشمہ کو جو کوئی گدلا کرنا چاہے خواہ غلو کی آمیزش کے ذریعہ، یا باطل کی ملاوٹ کے ذریعہ، یا جاہلانہ تاویل کے ذریعہ اس کو روکنا، اور امت کو اس سے بچانا اہل علم کی ذمہ داری ہے؛ لیکن یہ کام کوئی آسان نہیں ہے، یہ کار شیشہ وآہن ہے، جس میں بہ یک وقت فولاد کی سختی اور ریشم کی نرمی کی ضرورت ہوتی ہے، یہاں اپنوں سے بھی اُلجھنا ہے اور بیگانوں کو بھی اپنا بنانا ہے، اس کے لئے جگر کو خون کرنے اور آشیانہ کو جلا کر دین کے کاشانہ کو روشن کرنے کے عزم وحوصلہ کی ضرورت ہے، بقول شاعر :

پھونک کر اپنے آشیانہ کو
بخش دی روشنی زمانہ کو

اپنے گھر کو پھونک کر دوسروں کو روشنی بخشنا بڑے حوصلہ اور جذبہ کی بات ہوتی ہے اور یہ ہر کس وناکس کے بس میں نہیں ہے، اسی کی جانب آپ ﷺ نے اپنے اس ارشاد میں اشارہ فرمایا ہے کہ علماء تاریکی میں چراغ ہیں، جیسے چراغ جل کر دوسروں کو روشنی بخشتا ہے، ویسے ہی علماء کو بھی قربانیوں اور مجاہدات کی آگ میں جلنا ہے، خارزار میں آبلہ پائی کرنی ہے اور صرف آبلہ پائی نہیں کرنی؛ بلکہ خار راہ کو چومتے ہوئے آگے بڑھنا ہے :

میرے ساتھ ساتھ چلے وہی جوکہ خار راہ کو چوم لے
جسے کلفتوں سے گریز ہو ، وہ میرا شریک سفر نہ ہو

اکبر کا دین الٰہی ایک بڑا فتنہ تھا، جس کی سرکوبی کی سعادت اللہ تعالیٰ نے حضرت مجدد الف ثانیؒ کے مقدر میں رکھی تھی، اہل علم ونظر کا کہنا ہے کہ اگر اکبر کی سرکوبی کے لئے حضرت مجدد نہ کھڑے ہوئے ہوتے اور دارا شکوہ کے ہندو نظریات کے مقابل اورنگ زیب کی شخصیت نہ ہوتی تو ہندوستان میں مسلمانوں کا اسلامی تشخص باقی نہیں رہتا تھا۔

ہندوستان میں اسلامی تاریخ کئی نشیب وفراز سے گزری ہے؛ لیکن تقسیم ہند کے حالات بہت مہیب تھے، ایسا لگتا تھا کہ جس ملک کو مسلمانوں نے اپنے خون سے سینچا ہے، جہاں انھوں نے صدیوں حکومت کی ہے اور اس ملک کی تہذیب وتمدن پر گہرا اور دیرپا اثر چھوڑا ہے اور جہاں ان کی بیش قیمت علمی وفکری یادگاریں ہیں، وہ اس ملک سے حرف غلط کی طرح مٹا دیئے جائیں گے؛ لیکن پھر ایک بار کچھ صاحبان عزم وعزیمت تاریخ کے اس ہولناک موڑ پر ڈٹ گئے اور طے کرلیا کہ اگر ہم کو اس ملک میں جینا ہے تو اپنی اسلامی شناخت کے ساتھ جینا ہے، مسلمان بن کر اور رہ کر جینا ہے، اسلام کے بغیر زندگی کا کوئی تصور نہیں، آج اس ملک میں جو کچھ بھی اور جتنا کچھ بھی اسلام باقی ہے اور مسلمان باقی ہیں، وہ ان ہی اہل عزیمت کے عزم وحوصلہ کے انمٹ نقوش ہیں۔

سلسلۂ مجددیہ کے وابستگان کی دینی خدمات کی تاریخ بڑی روشن اور تابناک ہے، تقسیم ہند کے ہولناک اور صبر آزما حالات میں بھی اس سلسلہ کے جن بزرگوں نے دینی خدمات انجام دی ہیں اور مسلمانوں کو مسلمان بنائے رکھنے میں اپنی کوششیں صرف کی ہیں، ان میں ایک نمایاں اور ممتاز نام سلسلۂ مجددیہ سے وابستہ حضرت مولانا شاہ ہدایت علی جے پوریؒ کا ہے، آپ یوں تو رہنے والے رام پور کے تھے اور پیدل حج کے ارادہ سے نکلے تھے؛ مگر اجمیر تشریف لائے تو آپ کی ہمشیرہ نے آپ کو ازدواجی زندگی کے بندھن میں قید کرادیا، اس طرح آپ ہمیشہ کے لئے جے پور کے ہوکر رہ گئے اور یہیں آپ نے ارشاد وہدایت کی مسند آراستہ کی، جس سے خلق خدا کو بڑا نفع ہوا اور بالخصوص گجرات اور راجستھان میں بڑی تعداد میں لوگ آپ کے حلقہ ارادت سے وابستہ ہوئے۔

حضرت مولانا عبدالرحیم مجددیؒ حضرت شاہ ہدایت علیؒ صاحب کے بڑے صاحبزادے کے فرزند دلبند ہیں، حضرت شاہ صاحب نے آپ میں جوہر قابل دیکھ کر بچپن سے ہی آپ کو اپنی تربیت میں لے لیا تھا

اور فرماتے بھی تھے کہ میرے بعد میرا عبدالرحیم ہے، حضرت شاہ صاحب نے ہی اپنے پوتے کی دینی تربیت کی، راہ سلوک طے کرایا اور تصوف کی منزلوں سے آشنا کیا، اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ حضرت مولانا عبدالرحیم مجددیؒ کا بچپن جوانی سب حضرت شاہ صاحب کی نگرانی اور تربیت میں گزرا اور انھوں نے آپ کو اپنی تربیت کی بھٹی سے گزار کر کندن بنادیا۔

حضرت شاہ صاحب کی تربیت اور تعلیم کا اثر حضرت مولانا عبدالرحیم مجددیؒ میں پوری طرح جھلکتا تھا، دین کے لئے فکرمندی، اُمت کی سربلندی کی خواہش، مسلمانوں کو افلاس وادبار سے بچانے کا جذبہ، مسلمانوں کی دین ودنیا دونوں میں کامیابی اور سربلندی کی بھرپور کوشش، یہی آپ کی فکر کے بنیادی محور تھے اور ان ہی افکار نے آگے چل کر جامعہ ہدایت العلوم کا پیکر اختیار کرلیا۔

حضرت مولانا عبدالرحیم مجددیؒ اُن بزرگوں کی یادگار تھے، جن کو رہبانِ لیل اور فرسانِ نہار کہا گیا ہے، جن کی راتیں ذکر ومناجات اور گریہ وزاری میں گزرتی ہیں اور جن کے دن اسلام کی سربلندی اور ملت کی فلاح وبہبود کی کوشش میں صرف ہوتی ہیں، آپ ایک طرف اپنے دادا کی مسند ارشاد وہدایت کے سجادہ نشیں تھے تو دوسری طرف ایک بڑے تعلیمی ادارہ کے بانی اور مہتمم بھی، اسی کے ساتھ ملک کے مختلف باوقار دینی تعلیمی اور ملی اداروں کے رکن رکین بھی، آپ نے ان تمام متنوع ذمہ داریوں کو بڑی خوبی کے ساتھ انجام دیا، جے پور میں آپ کے زیر سرپرستی آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کا تاریخی اجلاس ہوا، جو بورڈ کی تاریخ میں ایک نمایاں مقام رکھتا ہے۔

آپ کی سیرت کا نمایاں پہلو فکری اعتدال اور ہر مسلک ومشرب والے سے رسم وراہ رکھنا ہے، یہی وجہ ہے کہ آپ کو حضرت مولانا علی میاں نوراللہ مرقدہ سے بڑی فکری مناسبت اور ارتباط تھا، اور ملی کاموں میں آپ کی کوششوں کے ثمر آور ہونے میں بھی اس کا نمایاں حصہ تھا، اسی فکری وسعت کی وجہ سے ہر طبقہ کے لوگ آپ کی جانب کھنچے چلے آتے تھے، وہ بھی جو دیندار تھے اور وہ بھی جو دین سے قدرے بیگانہ تھے، اور آپ کی صحبت کا اثر دھیرے دھیرے اس طرح چڑھتا تھا کہ وہ بھی کچھ عرصہ بعد دینی رنگ میں رنگ جایا کرتے تھے، نیز یہ فکری وسعت اسی حد تک تھی جہاں تک شریعت نے گنجائش دی ہے، جہاں شریعت نے گنجائش نہیں دی ہے، وہاں آپ فولاد کی طرح سخت ہوتے تھے، اور اس پر جم جاتے تھے؛ چاہے کسی کو برا لگے یا اچھا، اس میں کوئی مداہنت نہیں برتتے تھے۔

آپ علم کے معاملہ میں قدیم وجدید کی تقسیم کے قائل نہیں تھے، آپ مدارس کا ایسا نظام چاہتے تھے، جس میں علماء عصری علوم سے بھی آراستہ ہوں اور موجودہ عہد کے تقاضوں کے مطابق اسلام کی ترجمانی اور دفاع کا فریضہ انجام دے سکیں، کہتے ہیں کہ فرہاد نے تیشہ سے پہاڑ کاٹ کر نہر نکالی تھی، آپ نے راجستھان کے ریگستان میں اپنے اخلاص عمل سے علم ودین کا جو گلستان تعمیر کیا ہے، وہ بھی اسی کا مصداق ہے، جو پُرشکوہ بھی ہے، جاذب نظر بھی اور اس بات کی یادگار بھی کہ جس عمل میں اخلاص کا آب حیات ہو، وہ عمل زندۂ جاوید ہوجاتا ہے، خدا کرے یہ چمن یوں ہی قائم رہے، اخلاص کا پانی اس کو ملتا رہے، فکر ونظر کے پھول اس میں کھلتے رہیں اور علم وعمل کا پھل اس میں لگتا رہے :

ایں دُعا از من و از جملہ جہاں آمین باد

اسی کا نتیجہ ہے کہ علم ومعرفت اور رشد وہدایت کا جو شجرۂ طوبیٰ آپ نے لگایا تھا، اس کی آبیاری کے لئے خانوادۂ ہدایت کے چشم وچراغ محب گرامی وعالم ربانی حضرت مولانا شاہ فضل الرحیم مجددی دامت برکاتہم وعمت فیوضہم جیسا سالار کارواں میسر آیا، اللہ کا شکر ہے کہ ان کی قیادت میں جامعہ اور خانقاہ، مدرسہ اور اسکول نیز بہت سارے ملی کام تسلسل کے ساتھ انجام پا رہے ہیں، دُعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ ان خدمات کو بقاودوام عطا فرمائے، اس کا فیض دور تک پہنچے اور دیر تک جاری رہے۔

ربنا تقبل منا انک أنت السميع العلم .

● ● ●

فتاویٰ

مولانا شاہد علی قاسمی
(استاذ: المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد)

مسجد کے مائک سے نماز، درس قرآن وحدیث وتعلیم

سوال:- کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام درج ذیل مسائل کے بارے میں :

۱- کیا مسجد کے بیرونی مائک میں پنج وقتہ فرض نمازیں پڑھا سکتے ہیں؟

۲- کیا مسجد کے بیرونی مائک میں درس قرآن، درس حدیث، بچوں کو کلمات مع دعائیں وغیرہ یاد دلا سکتے ہیں؟

۳- مسجد کے بیرونی مائک سے ایسے مسائل زور سے بیان کرنا جس مسئلہ کا تعلق حیاء سے ہو؟ (شیخ عمر، باسم اللہ کالونی شاہین نگر)

الجواب و باللہ التوفیق:-

۱- پنج وقتہ نمازوں کے لئے بیرونی مائک کا استعمال عام ہے؛ لیکن یہ شریعت کے منشاء اور مزاج کے خلاف ہے؛ کیوں کہ قرآن کی آواز جس مسلمان کے کان میں جائے اس پر واجب ہوجاتا ہے کہ غور سے سنے، اور گفتگو بند کردے؛ لیکن ظاہر ہے کہ یہ پریشانی کا باعث ہے، آواز سننے والا سوچے گا کہ ضروری گفتگو اور ضروری کام کروں یا بیٹھ کر قرآن سنوں، دوسری خرابی بلند آواز سے خلل پیدا ہونا ہے، بہت سے لوگ اُلجھن محسوس کرتے ہیں، روز روز کی چھوٹی اُلجھن بڑی اُلجھن میں تبدیل ہوجاتی ہے، اس لئے اس سے احتراز چاہیے، علامہ حصکفیؒ فرماتے ہیں :

ویجهر الإمام وجوبا بحسب الجماعة، فإن زاد عليه أساء۔ (۱)

(۱) الدرالمختار مع الرد: 1/532۔

۲- درس حدیث اورکلمات اور دُعاؤں میں پہلی والی خرابی نہیں ہے؛ البتہ دوسری خرابی آواز سے تکلیف والی موجود ہے، اور درس قرآن میں مختصر آیات پڑھ کرزیادہ تفسیری باتیں ہوں تو یہ دوسری خرابی کے دائرہ میں آئے گا، علامہ شامیؒ فرماتے ہیں :

و في الزاهدي عن أبي جعفر : لو زاد على الحاجة فهو أفضل ، إلا إذا أجهد نفسه أو آذى غيره ، قهستاني ۔ (۱)

۳- مسائل بیان کرنے میں مزید احتیاط لازم ہے، حیا والے مسائل اس طرح بیان کرنا حیا کے تقاضوں کے خلاف ہے، بہرحال مائیک کا بے جا استعمال مروج ہے، اعتدال کی رعایت نہیں ہے، ضرورت سے زیادہ آواز کو شرعاً پسند نہیں کیا گیا ہے، اس لئے لوگوں کو چاہیے کہ منشاء شریعت کے دائرہ میں مائیک کا استعمال کریں۔

اس شخص کی امامت جو قرآن صحیح طور پر نہ پڑھ سکتا ہو

سوال :- کیا ایسے امام کے پیچھے نماز درست ہے جو قرآن کریم پڑھتے وقت الفاظ کی ادائیگی پر قادر نہ ہو۔ (شیخ عمر، باسم اللہ کالونی شاہین نگر)

الجواب و باللہ التوفیق :- جو امام قرآن کریم پڑھتے وقت الفاظ کی ادائیگی نہ کرپاتا ہو اور لحن جلی کے دائرہ میں آجاتا ہو اس کے لئے امامت کرنا درست نہیں ہے، حنفی فقیہ علامہ حصکفیؒ فرماتے ہیں :

ولا تصح صلاته إذا أمكنه الاقتداء بمن يحسنه أو ترك جهده أو وجد قدر الفرض مما لا لثغ فيه ، هذا هو الصحيح المختار في حكم الألثغ ، وكذا من لا يقدر على التلفظ بحرف من الحروف أولا يقدر على إخراج الفاء إلا بتكرار ۔ (۲)

اجنبیہ لڑکی سے عشق کرنے والا امام مسجد اور اس کی امامت کا حکم

سوال :- کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ میں کہ : شادی شدہ صاحب اولاد شخص ایک طویل عرصہ سے اجنبی جوان لڑکی سے عشق و محبت کا تعلق رکھتا ہے؛

(۱) رد المحتار مع الدر: 1/532۔ (۲) الدر المختار: 1/79۔

چنانچہ جب اس سے دُور رہتا ہے تو بڑے موبائل کے ذریعہ گھنٹوں پیار ومحبت کی باتیں کرتا ہے، اور جب اس لڑکی سے قریب رہتا ہے تو خود اس کے گھر آنا جانا اور عشق ومحبت کی باتوں کا سلسلہ جاری رہتا ہے، اور برابر اس کی مالی مدد کرتا ہے، جس کا پورے محلہ میں چرچا ہے، دریافت طلب امر یہ ہے: (الف) یہ تعلق شرعاً جائز ہے؟ (ب) ایسا شخص مسجد کا امام بن سکتا ہے؟ (ج) ایسے شخص سے انعقاد نکاح کا مبارک کام لیا جانا چاہیے؟ (احمد حسین، حسامی)

الجواب و باللہ التوفیق:- اگر امام کی وہی کیفیت ہے جو سوال میں مذکور ہے تو ایسا شخص فاسق ہے؛ کیوں کہ غیر محرم لڑکی سے معاشقہ کرنا حرام ہے، اور حرام کا مرتکب فاسق ہوتا ہے؛ لہٰذا (الف) اس شخص کا اجنبی لڑکی سے تعلق بنائے رہنا جائز نہیں ہے، (ب) اس کے پیچھے نماز پڑھنا مکروہ ہے، اس لئے ایسے شخص کو امام نہ بنایا جائے، ہاں، اگر وہ سچی توبہ کرلے اور محتاط زندگی گذارنے لگے تو پھر اس کا امامت کرنا بلا کراہت درست ہوگا، (ج) انعقاد نکاح کا کام بھی نیک اور متقی حضرات سے کرانا چاہیے، سوال میں مذکور شخص جب تک توبہ نہ کرے تب تک اس سے انعقاد نکاح کا کام لینا مناسب نہیں ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ کوئی مرد کسی غیر محرم عورت کے ساتھ تنہائی اختیار نہ کرے؛ کیوں کہ تنہائی اختیار کرنے کی صورت میں تیسرا شیطان ہوتا ہے: ''**ألا لا یخلون رجل بامرأة إلا کان ثالثهما الشیطان**'' (۱) اسی طرح فقہاء نے غیر محرم سے غیر ضروری گفتگو کرنے سے منع کیا ہے: ''**ولا یکلم الاجنبیة الا عجوزا**''۔(۲)

مہر سے زیادہ رقم پر خلع کا معاملہ

سوال:- کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام مسئلہ ذیل کے بارے میں کہ: زید نے اپنے لڑکے عمر کا نکاح بکر کی لڑکی ہندہ سے کرایا، ہندہ رخصتی سے قبل ہی اجنبی لڑکے کے ساتھ بھاگ گئی اور ایک ماہ میں لوٹی، ہندہ کی واپسی کے بعد فریقین یعنی زید اور بکر کے اقرباء مسئلہ کے حل کے لئے بیٹھے، زید نے بکر پر بہت زیادہ

(۱) ترمذی، حدیث نمبر: 1171۔

(۲) الدر المختار، کتاب الحظر والاباحۃ۔

ناراضگی کا اظہار کیا کہ میں نے آپ سے بھی اور لڑکی سے بھی نکاح سے قبل صاف لفظوں میں یہ معلوم کرلیا تھا کہ یہ رشتہ پسند ہے یا نہیں؟ کیوں کہ آج کے فتنہ کے دور میں نکاح کے بعد دھوکہ ہوجاتا ہے،لڑکی ووالد نے بلا جھجک پسندیدگی ظاہر کی ، پھر نکاح ہوجانے کے بعد غیرمحرم کے ساتھ بھاگ کر مجھے دھوکہ دیا گیا، میری بےعزتی ہوئی،نکاح میں اخراجات بھی ہوئے،اس لئےخلع کے لئے مجھے دس لاکھ روپے چاہئے، بالآخر پانچ لاکھ روپے طئے پائے،جس کی ایک تحریر تیار کی گئی، جانبین کے دستخط ہوئے، یہ معاملہ عندالشرع جائز ہوا یا نہیں؟ مدلل تحریر فرما کر رہنمائی فرمائیں۔(محمد کلیم الدین مظاہری،بیگم پیٹ)

الجواب و باللہ التوفیق:- دریافت کردہ صورت میں لڑکی کی طرف سے کوتاہی ہے،جس میں شوہر کے لئے مال کے عوض طلاق دینا جائز ہوجاتا ہے،گو کہ مہر سے زیادہ لینا ناپسندیدہ ہے؛لیکن یہ ناجائز کے دائرہ میں نہیں ہے؛لہٰذا لڑکے والوں کا پانچ لاکھ لینا درست ہے،گو کہ بہتر نہیں،مال کے عوض طلاق دینا ہی خلع کہلاتا ہے :

(وكره) تحريمًا (أخذ شيء) ويلحق به الإبراء عما لها عليه (إن نشز وإن نشزت لا) ولو منه نشوز أيضًا ولو بأكثر مما أعطاها على الأوجه فتح وصحح الشمني كراهة الزيادة وتعبير الملتقى لا بأس به يفيد أنها تنزيهية وبه يحصل التوفيق . (قوله : وكره تحريما أخذ شيء) أي قليلًا أو كثيرًا والحق أن الأخذ إذا كان النشوز منه حرام قطعًا ؛ لقوله تعالى : ''فلا تأخذوا منه شيئًا'' (النساء:20) إلا أنه إن أخذ ملكه بسبب خبيث وتمامه في الفتح لكن نقل في البحر عن الدر المنثور للسيوطي أخرج ابن جرير عن ابن زيد في الآية قال ثم رخص بعده فقال : '' فإن خفتم ألا يقيما حدود الله فلا جناح عليهما فيما افتدت به'' (البقرة:229) قال : فنسخت هذه تلك اهـ وهو يقتضي حل الأخذ مطلقا إذا رضيت اهـ أي سواء كان

النشوز منه أو منها أو منهما لكن فيه أنه ذكر في البحر أولا عن الفتح أن الآية الأولى فيما إذا كان النشوز منه فقط والثانية فيما إذا لم يكن منه فلا تعارض بينهما ۔ (۱)

شوہر کے مرتد ہوجانے کے بعد بیوی کا دوسرے مرد سے نکاح کرنا

سوال :- کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ میں کہ: نور جہاں بنت محمد قاسم صاحب کا نکاح مؤرخہ: 22/اگست 2004ء کو بہ مقام درگاہ قاضی پیٹھ نومسلم عبدالرشید سابق نام کرن گوری شنکر سے ہوا، شادی کے بعد وہ تین سال تک ساتھ رہا، اور اس کے بعد پانچ سال تک اس نے اپنی اہلیہ کی کوئی خبر نہیں لی؛ بلکہ پانچ سال سے روپوش ہے، اور اب پتہ چلا ہے کہ وہ پھر سے ہندو مذہب کو اپنالیا ہے، اور ہندو لڑکی سے شادی کرلی، اور بچے بھی ہیں، دریافت طلب امر یہ ہے کہ نور جہاں بنت محمد قاسم ساکن ضلع ورنگل کے نکاح ثانی کے سلسلہ میں شریعت کا کیا حکم ہے؟ کیا اس خاتون پر عدت بھی واجب ہوگی؟ شرعی رہنمائی فرمائیں۔ (ایک دینی بہن، ورنگل)

الجواب وباللہ التوفیق:- شوہر اسلام چھوڑ کر کفر اختیار کرلے تو نکاح کا رشتہ ختم ہوجاتا ہے، پھر اگر شوہر توبہ کرلے اور دوبارہ اسلام میں داخل ہوجائے تو تجدید نکاح کرکے ٹوٹا ہوا رشتہ قائم کیا جاسکتا ہے؛ لیکن اگر شوہر توبہ نہ کرے اور اسلام میں داخل نہ ہو تو بیوی کو حق مل جاتا ہے کہ عدت گذار کر کسی مسلم مرد سے نکاح کرلے، مشہور حنفی فقیہ فرماتے ہیں :

أخبرت بارتداد زوجها فلها التزوج بآخر بعد العدة استحسانا كما في الاخبار من ثقة ۔ (۲)

لہٰذا اگر یہ بات درست ہو کہ نور جہاں بنت محمد قاسم کے شوہر نے ہندو مذہب اختیار کرلیا ہے، تو دونوں کا رشتہ نکاح ختم ہوگیا، اور نور جہاں کے لئے عدت گزارنے کے بعد کسی مسلم مرد سے نکاح کرنا درست ہوگا، اگر

(۱) الدرالمختار مع حاشیہ ردالمحتار: 3/445۔

(۲) الدرالمختار مع الرد: 4/210۔

سوال میں مذکور مرد کے کافر ومرتد ہوجانے کے بعد نور جہاں کو تین ماہواری گذر چکی ہو، یا زیادہ عمر کی وجہ سے ماہواری نہ آتی ہو تو تین ماہ گذر چکے ہوں یا حاملہ تھی تو وضع حمل ہو گیا ہو تو اس کی عدت ختم ہو گئی، خواہ نور جہاں کو عدت کی بات کا علم نہ ہو، اس لئے اس خاتون کے لئے کسی دوسرے مسلم مرد سے نکاح کی اجازت ہے۔

مکتب کا نظام چلانے کیلئے زکوٰۃ کی رقم وصول کرنا

سوال:- عرض مسئلہ یہ ہے کہ میں حیدرآباد میں رہتا ہوں اور خانگی ملازم پیشہ ہوں، مزید دینی تعلیم سے بھی آراستہ ہوں، خدمت کی غرض سے پچھلے آٹھ سال سے مکاتب چلا رہا ہوں، مکاتب کے قیام اور اس میں مضبوطی پیدا کرنا اور اس کی حفاظت کرنا وقت کی اولین ضرورت ہے، جیسا کہ علماء کرام سے میں نے سنا ہے، شروع میں ایک ہی مکتب تھا؛ لیکن فی الحال پانچ مکاتب مختلف علاقوں میں واقع ہیں اور آئندہ مزید کا اضافہ کرنا ہے، مکاتب کا وقت عصر تا عشاء ہے اور مکمل مضبوطی کے ساتھ تعلیمی نظام جاری ہے، مکاتب میں پڑھنے والے طلبہ مناسب گھرانوں کے ہوتے ہیں، ان سے فیس لی جاتی ہے اور باضابطہ انھیں ترغیب بھی دی جاتی ہے؛ لیکن بہت سارے طلبہ ایسے بھی ہیں جو فیس ادا کرنے سے قاصر ہیں اور ان کے سرپرست اپنے حالات سناتے ہیں اور فیس میں کمی یا مکمل معافی کی درخواست کرتے ہیں، مکاتب میں فیس ۳۰۰ روپے ماہانہ ہے؛ کیوں کہ ایک درجہ میں ہم صرف ۱۵ طلبہ کو ہی رکھتے ہیں؛ تا کہ استاذ صحیح طور پر تعلیم دے سکے۔

شروع سے تمام اخراجات فیس کے ذریعے اور میری ذاتی رقم اور میرے بعض دوستوں کے تعاون سے پورے ہوتے تھے؛ لیکن اب چوں کہ مکاتب میں اضافہ ہو رہا ہے تو مشکل پیش آرہی ہے، اب تک ہم نے اخراجات کی تکمیل کے لئے زکوٰۃ وصدقات کو ذریعہ نہیں بنایا؛ کیوں کہ ضرورت نہیں تھی؛ لیکن اب اس کی اشد ضرورت محسوس ہو رہی ہے، مثال کے طور پر جس طرح مدارس میں فیس ہوتی ہے اور بعض طلبہ دیتے ہیں اور بعض جزوی یا مکمل نہیں دیتے اور اس

کی تکمیل عام زکوٰۃ وصدقات اور چندوں کے ذریعہ طے پاتی ہے، میں نے جب
یہ علت دیکھی تو مجھے یہی علت مکاتب کے نظام میں بھی نظر آئی جس سے مجھے
زکوٰۃ وصدقات کے حصول میں کوئی حرج نظر نہیں آرہا ہے؛ لیکن چاہتا ہوں کہ
باضابطہ قرآن وحدیث کی روشنی میں مفتیان کرام سے جواب معلوم کروں، ان
تمام چیزوں کو مدنظر رکھتے ہوئے کیا مکاتب میں مستحق طلبہ کے نام پر زکوٰۃ
وصدقات کی رقم مکاتب کے اخراجات جیسے اساتذہ وعملہ کی تنخواہیں، مکان کا کرایہ
وغیرہ کے لئے استعمال کی جاسکتی ہے؟ برائے کرم قرآن وحدیث کی روشنی میں
جومناسب جواب ہو تفصیلی طور پر عنایت فرمائیں۔(عبداللہ عفی عنہ، سعید آباد)

الجواب وباللہ التوفیق:- زکوٰۃ کے مستحق فقراء ومساکین ہوتے ہیں، اور یہ بھی ضروری ہے کہ زکوٰۃ کی رقم مستحقین کو تملیکاً دی جائے، تب ہی زکوٰۃ ادا ہوتی ہے، جہاں تک غیر اقامتی مکتب میں اساتذہ کی تنخواہ اور دیگر ضروریات کے لئے زکوٰۃ کی رقم استعمال کرنے کی بات ہے تو چوں کہ ادائیگی زکوٰۃ کی شرطوں کی رعایت نہیں ہو پاتی ہے، اس لئے غیر اقامتی مکاتب میں زکوٰۃ کی رقم استعمال کرنے سے منع کیا جاتا ہے، آپ نے جس طرح مکاتب کا نظام چلایا ہے وہ قابل قدر ہے، اب اس نظام کے بڑا ہونے کی وجہ سے اخراجات پورا کرنا دشوار ہو رہا ہے تو اولاً کوشش کریں کہ صدقہ نافلہ اور عطیہ کی رقم سے ضرورت پوری ہو، اگر اس میں بھی دشواری ہو تو اس کی گنجائش ہے کہ مستحق طلبہ کی معروف تعلیمی فیس مقرر کرلیں، اور آپ بقدر ضرورت زکوٰۃ کی رقم وصول کر کے دفتر میں جمع کردیں، پھر یہ مستحق باشعور طلبہ اس دفتر سے تعلیمی فیس کے بقدر زکوٰۃ کی رقم وصول کر کے دوسرے دفتر میں فیس تعلیمی جمع کردیں، اگر بعض مستحق طلبہ باشعور نہ ہوں تو ان کے مستحق زکوٰۃ سرپرست یہ کام کریں، اس طرح تملیک کی شکل پائی جائے گی اور زکوٰۃ ادا ہو جائے گی، اور مکتب کا نظام بھی چلتا رہے گا، اس سلسلہ میں حیلہ تملیک کا ذکر بھی کیا جاتا ہے، جو کبھی کبھار تو ٹھیک ہے؛ لیکن بار بار حیلہ تملیک مناسب نہیں، بہرحال، آپ مکتب کا نظام بحال رکھنے کے لئے بقدر ضرورت زکوٰۃ وصول کر کے اور اس کا صاف شفاف حساب رکھ کر پوری احتیاط کے ساتھ کام کریں:

لا يجوز أن يبنى بالزكاة المسجد ، وكذا القناطر والسقايات ،
وإصلاح الطرقات ، وكري الأنهار والحج والجهاد ، وكل ما لا

تمليك فيه ، ولايجوز أن يكفن بها ميت ، ولايقضى بها دين الميت ، كذا في التبيين ۔ (۱)

ويُشْتَرَطُ أنْ يَكُوْنَ الصَّرْفُ تَمْلِيْكاً لَا اباَحَةً ... فَلَا يَكْفِيْ فِيْها الْاطْعَامُ الاّ بِطَرِيْقِ التَّمْلِيْكِ ۔ (۲)

قبرستان کیلئے وقف اراضی پر دُکانیں اور آفس بنانا

سوال :- کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام وعلماء دین شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں کہ: ہمارے گاؤں دامت میں جامع مسجد ہے، اور اس مسجد کے ماتحت ایک صاحب نے اپنی زمین کو قبرستان کے لئے وقف کیا ہے؛ حالاں کہ وہاں بہت پہلے تقریباً ۳۰/سال قبل کچھ قبریں تھیں؛ لیکن اس سے پہلے گاؤں میں ۲/قبرستان ہیں اور اب سے پچاس سال بعد بھی اس نئے قبرستان کی ضرورت پیش نہیں آئیگی، تو اب مسجد کمیٹی کا خیال ہے کہ قبرستان کے لئے نئی وقف شدہ جگہ چوں کہ روڈ ٹچ (لب سڑک) ہے، اس لئے اس زمین کے اوپر ۱۲ تا۱۵ فٹ کی دکانیں بنائی جائیں اور وہ کرایہ پر دے دی جائیں، جوبھی کچھ آمدنی ہوگی وہ ساری آمدنی مسجد کی مصالح کے لئے استعمال ہوگی، تو اب مفتیان کرام کی خدمت میں سوال یہ ہے کہ کیا اس طرح کرنا شرعاً جائز ہے؟ نیز یہ کہ اس جگہ پر قبرستان کے لئے آفس بنائی جاسکتی ہے یانہیں؟ براہ کرم شریعت کی روشنی میں تفصیلی جواب سے نوازکر ممنون ومشکور فرمائیں، عین نوازش ہوگی۔(عبدالمنان نجے، امام وخطیب جامع مسجد دامت، رائےگڑھ، کوکن)

الجواب وباللہ التوفیق:-

1- موقوفہ زمین کا استعمال بنیادی طور پر اسی کام کے لئے ہونا چاہیے جس کے لئے واقف نے وقف کیا ہو۔

(۱) فتاویٰ ہندیہ:1/188، ط:رشیدیہ۔

(۲) الدرالمختار مع الرد:3/291، ط:زکریادیوبند۔

2- دریافت کردہ صورت میں اگر واقف زندہ ہوتو اس سے اجازت لے کر دکانیں اور قبرستان کے اُمور کی انجام دہی کے لئے آفس بنائی جاسکتی ہے۔

3- اگر واقف زندہ نہ ہوتو مسجد کمیٹی والے قبرستان کے تحفظ کی نیت سے دکانیں اور آفس بنا سکتے ہیں، ایسی صورت میں دکانوں کا کرایہ اولاتینوں قبرستان کی مصلحتوں، احاطہ بندی، لاوارث نعشوں کی تدفین وغیرہ میں خرچ کیا جائے؛ تاکہ واقف کا منشاء زیادہ سے زیادہ پورا ہو، اگر آئندہ رقم زیادہ بچ جائے اور قبرستان کو مستقبل قریب میں اس رقم کی ضرورت نہ ہوتو اس کا استعمال مصالح مسجد میں کیا جاسکتا ہے۔

4- جب آئندہ اس قبرستان میں تدفین شروع ہوجائے اور دکانوں والی جگہ میں تدفین کی ضرورت پیش آجائے تو مسجد کمیٹی والوں کی ذمہ داری ہوگی کہ دکانوں کو منہدم کرکے اس جگہ کو تدفین کے لئے استعمال کریں۔

کرپٹو کرنسی کے ذریعہ کمائی

سوال:- کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک سکہ (ڈیجیٹل کرنسی) جس کا نام کرپٹو کرنسی ہے، اس کے ذریعے لوگ روزمرہ بازاروں میں آن لائن پیسے کما رہے ہیں، جس کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ گوگل پلے اسٹور پر ایک اپلی کیشن ہے جس کا نام ''ٹوکن پاکیٹ'' (token pocket) ہے اس میں اپنا اکاؤنٹ بنایا جاتا ہے اور اکاؤنٹ بنانے کے بعد ہمیں ٹرون (tron) نامی سکے ملنے شروع ہوجاتے ہیں، جن کو ہم ڈالرز کی قیمت پر دیکھتے ہیں اور اس سکہ کو فوراً ڈالر میں تبدیل کر لیتے ہیں، اب یہ ڈالر دو طریقے سے ملتے ہیں ایک تو مفت میں، دوسرے اس میں پیسے جمع کرکے، جو پیسے جمع نہیں کرتے مفت میں اس سے فائدہ اُٹھاتے ہیں (یہ لوگ اپنی آئی ڈی کسی کی آئی ڈی سے منسلک کرتے ہیں) تو انھیں روزانہ ایک ڈالر کا چھٹا حصہ ملتا ہے، جس کے ہندوستانی تقریباً تیرہ یا چودہ روپے بنتے ہیں، ڈالرز زیادہ ہونے کی صورت میں آمدنی (income) بڑھ کر زیادہ ہوجاتی ہے، مثلاً ایک دن میں تیس روپے ملنے شروع ہوجاتے ہیں، جو حضرات اس میں پیسے جمع کرتے ہیں

(جو لوگ وہ پیسے بطور قرض دینے کے مساوی ہوتے ہیں، جن کو کمپنی بعد میں لوٹانے کی یقین دہانی کراتی ہے) ان کو پیسے کے عوض نقد ڈالر ملتے ہیں، مثلاً اگر کوئی ایک ہزار روپے جمع کرتا ہے تو اس کو ایک دن میں ایک ڈالر ملتا ہے جو دس ہزار جمع کرتا ہے اسے ایک دن میں دس ڈالر ملتے ہیں اور یہ ڈالر ملتے ملتے ڈبل بھی ہو جاتے ہیں، یہ بزنس بلاک چین کے بیس (bass) پر قائم ہے یعنی ایک آدمی دوسرے کو جوڑتا ہے، جوڑنے والے کو یہ فائدہ ہوتا ہے کہ فوری طور پر اس کو کچھ ڈالروں کی کی شکل میں ایوارڈ ملتا ہے اور بعد میں جس کو جوڑتا ہے اس کی کمائی کا دس فیصدی بھی اس کو ملتا ہے، یہ دوسرا تیسرے کو جوڑتا ہے، اس طرح نیچے تک چلا جاتا ہے، بزنس کا طریقہ، جس اپلی کیشن پر ہم نے اپنا اکاؤنٹ بنا کر پیسے جمع کئے تھے، اس ایپ کو کھول کر ایک مرتبہ کلک کرنا ہوتا ہے صرف یہ عمل ہوتا ہے اس کے سوا کوئی عمل نہیں ہوتا، کلک کرنے کے بعد اسکرین پر ساٹھ عدد نمبرات شو show کرتا ہے اور فوراً ہمیں اپنے ڈالرز مل جاتے ہیں۔

اس بزنس کے اہم پوائنٹس اور خلاصہ: ٹرون کمپنی ایک ڈیجیٹل مارکیٹ ہے، ٹرون سکے کو کسی ملک نے کرنسی کے طور پر ابھی تک تسلیم نہیں کیا؛ البتہ بعض کمپنیاں اس کی قیمت کو تسلیم کرتی ہیں، اور اپنی تیاری کردہ مصنوعات، کار، کپڑا وغیرہ فروخت کرتی ہیں، ٹرون سکہ محض ایک خیالی اور فون اسکرین پر نظر آنے والے سکہ کی ایک تصویر ہے، جس کا مادہ بھی اصلا موجود نہیں ہے، جس کمپنی کو ہم پیسہ انویسٹ کر رہے ہیں اس کا کوئی مادی کاروبار نہیں ہوتا، کمپنی کب غبن کر بیٹھے اس کی کوئی ضمانت (guarantee) نہیں ہے، سوال یہ ہے کہ کیا ٹرون سکہ کے ذریعہ سے ہم اپنا پیسہ انویسٹ کر کے آمدنی حاصل کر سکتے ہیں؟ اور اس کاروبار کو اپنے طور پر ترقی دے سکتے ہیں؟ اور کیا اس طرح کمپنی سے حاصل ہونے والی رقم کا استعمال جائز ہے؟ کیا یہ کاروبار سودی کاروبار میں شامل ہوگا؟ اگر یہ سودی کاروبار ہے تو اب تلک جو میں نے اس سے آمدنی حاصل کی ہے اس کا کیا حکم ہے؟ (سالم فاروق ندوی، مظفر نگر، اتر پردیش)

الجواب و باللہ التوفیق:- ٹوکن یا کیٹ سے نفع کمانا جائز نہیں ہے؛ کیوں کہ اس کاروبار کے پیچھے کوئی مادی مال نہیں ہے، نیز یہ کرنسی اربابِ افتاء کی رائے میں حقیقی کرنسی نہیں ہے؛ بلکہ فرضی ہے، یہ دونوں باتیں معاملہ کے باطل ہونے کے لئے کافی ہیں، اسی طرح اس سے جڑ کر ممبر سازی کرنا اور نفع کمانا بھی درست نہیں ہے؛ کیوں کہ باطل کام میں تعاون کرنا اور اسے ذریعہ آمدنی بنانا آیت کریمہ: ''وَلاَ تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَان'' (المائدہ:2) کی روشنی میں درست نہیں ہے، مسلمانوں کو ایسے کاروبار سے لازماً بچنا چاہیے۔

تقسیم جائیداد کی ایک صورت

سوال:- کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام درج ذیل مسئلہ کے بارے میں کہ محمد اسماعیل کے دو لڑکے ہیں: (1) محمد سلیمان، (2) عبدالمنان، ان میں محمد سلیمان بڑے ہیں اور عبدالمنان چھوٹے، محمد سلیمان کی وفات 2006 میں ہوئی، محمد اسماعیل کی زمین کی تقسیم محمد سلیمان کی وفات کے بعد ہوئی، جب محمد سلیمان کی وفات ہوئی تو وہ اپنے پیچھے نو اولاد اناث، بیوی، ایک بھائی اور ایک بہن کو چھوڑا، محمد سلیمان نے اپنی زندگی میں پانچ بیٹیوں کی شادی کی اور چار کنواری تھی، جن میں سے بعض نابالغ تھیں، اب سوال یہ ہے کہ :

1- محمد سلیمان کی بیوی اور نابالغ وکنواری بچیوں کا نفقہ کس پر ہے؟

2- محمد سلیمان کے بھائی اور بہن نے ان کی بچیوں پہ کبھی توجہ نہیں دی، نہ کبھی حال واحوال دریافت کیا۔

3- محمد اسماعیل کی زمین کی تقسیم ان کے دونوں لڑکوں کے درمیان محمد سلیمان کی وفات کے بعد ہوئی، اور محمد سلیمان کی بیوی اپنے شوہر کی زمین کو بیچ بیچ کر اپنی بچیوں کی پرورش اور ان کی شادی کی۔

4- عبدالمنان جو محمد سلیمان کے چھوٹے بھائی ہیں، وہ کبھی اپنے بھائی کی بیوہ اور بچیوں کی خبر گیری نہیں کی؛ لیکن جب محمد سلیمان کی بیوی کا انتقال ہوا تو اب اس کا دعویٰ ہے کہ جو زمین بیچی گئی وہ تم لوگوں کی تھی، اب بقیہ زمین میری ہے، اس میں تم لوگوں کا حق نہیں ہے؛ کیوں کہ میں اپنے بھائی کا وارث ہوں، شرعاً اس کا کیا حکم ہے؟

5- بقیہ زمین کی تقسیم وارثین کے درمیان کس طرح عمل میں آئے گی؟

6- محمد سلیمان کی وفات کے بعد زمین کی تقسیم میں سارے وارثین کی اجازت ودستخط ضروری ہے؟

7- اگر بہنوں نے کوئی زمین کسی ایک بہن کو دے دیا تو کیا وہ اس کا مالک ہوگئی؟

8- محمد سلیمان کے علاج ومعالجہ میں اگر کسی نے خرچ کیا ہوتو کیا وہ اس کے ترکہ سے اپنا قرض لے سکتا ہے؟

9- واضح ہو کہ ان سارے اُمور سے عبدالمنان واقف تھے اوراس پر انھوں نے کبھی اعتراض نہیں کیا، قرآن وحدیث اور فقہ اسلامی کی روشنی میں جوابات مرحمت فرمائیں۔ (حافظ محمد داؤود، جھگڑوا، دربھنگہ، بہار)

الجواب و باللہ التوفیق:-

1- محمد سلیمان کی بیوی اور غیر شادی شدہ لڑکیوں کا نفقہ دوسروں پر اس وقت واجب ہوگا جب کہ ان کے پاس مال نہ ہوں، اگر ان کے پاس مال یا جائیداد ہوں تو یہ لوگ ان ہی مال وجائیداد سے اپنے اخراجات پورے کریں، ہاں اگر مال وجائیداد نہ ہوتو بیوہ کا خرچ اس کا باپ اُٹھائے، باپ نہ ہوتو دادا اُٹھائے وہ بھی نہ ہوتو اس بیوہ کے جو لوگ وارث بن سکتے ہیں جیسے بیوہ کی ماں، بیٹی، بھائی بہن وغیرہ، یعنی بالفرض ابھی بیوہ کا انتقال ہوتو کون کون لوگ وارث بن سکتے ہیں وہی لوگ حصہ میراث کے تناسب سے بیوہ کے اخراجات اپنے اوپر منقسم کرلیں؛ البتہ جو خود تنگ دست ہوان پر ذمہ داری عائد نہیں ہوگی؛ لیکن اب جب کہ بیوہ زندہ نہیں ہے تو اس کا معاملہ ختم ہوگیا، کنواری بیٹیوں کے اخراجات ان کے باپ دادا نہ ہونے کی وجہ سے ان کے وارثین پر عائد ہوں گے، جیسے بہن، اور چچا وغیرہ، یعنی اگر بالفرض ان بیٹیوں کا اس وقت انتقال ہوتو کون کون لوگ وارث بن سکتے ہیں وہی لوگ حصہ میراث کے تناسب سے اخراجات اُٹھائیں گے؛ البتہ جو خود تنگ دست ہوں ان پر ذمہ داری عائد نہیں ہوگی۔

2- محمد سلیمان کی بیوہ اور بچیوں کی خبر گیری نہ کرنا غیر ذمہ دارانہ بات ہے، عبدالمنان صاحب اوران کی بہن کو چاہیے کہ کوتاہیوں کی تلافی کریں، اورآئندہ ذمہ داری نبھائیں۔

3- بیوہ کا زمین بیچ کر بچیوں کی شادی اور دوسرے اخراجات کو پورا کرنا بہ حیثیت سر پرست کے درست تھا۔

4، 5- محمد سلیمان کولڑکا نہ ہونے کی وجہ سے اس کا تمام ترکہ اس کی بیوی اورلڑکیوں کو نہ مل سکے گا؛ بلکہ کچھ اس کے بھائی اور بہن کو ملے گا؛ چنانچہ بیوہ کو آٹھواں حصہ اور بیٹیوں کو دو تہائی حصہ مل سکے گا، باقی اس کے بھائی بہن کو ملے گا؛ چنانچہ میراث کی تقسیم کے اُصول کے مطابق محمد سلیمان کے ترکہ کے جملہ 72 حصے کئے جائیں گے،جن میں بیوہ 9 حصے اور بیٹیوں کو 48 حصے ملیں گے اور باقی 15 حصوں میں سے 10 حصے بھائی کواور 5 حصے بہن کو ملیں گے، بیوہ کا 9 حصہ اس کے وارثین کی طرف منتقل ہوگا، اس تفصیل کی روشنی میں عبد المنان اوراس کی بہن کو اپنے مرحوم بھائی کی جائداد سے (72 میں سے) 15 حصے لینے کا حق ہے،اس سے زیادہ کا حق نہیں ہے۔

6- زمین کی تقسیم کے وقت تمام وارثین کا دستخط ضروری نہیں ہے؛ البتہ ہر ایک کو اس کا حق پہنچنا ضروری ہے۔

7- اگر کسی بہن نے اپنا حق کسی بہن کو دے دیا اور اس کے قبضہ میں دے دیا تو وہ اس کی مالکہ ہوگئی، اس میں کسی کو مداخلت کا حق نہیں ہوگا۔

8- محمد سلیمان کے علاج و معالجہ میں کسی نے اپنے طور پر خرچ کیا تھا تو اس کو وصول کرنے کا حق نہیں ہے؛لیکن اگر قرض کے طور پر خرچ کیا گیا تھا تو اس کے ترکہ سے وصول کرنے کا حق ہے،قرض کے طور پر اس وقت مانا جائے گا جب کہ محمد سلیمان نے خرچ کرنے کے لئے کہا ہو یا کم از کم خرچ کرنے والے نے خرچ کرنے کے وقت اس کی صراحت کردی ہو۔

نوٹ:- اگر عبد المنان صاحب نے خود سے زمین تقسیم کر کے مرحوم بھائی کے وارثین کو دیا ہو تو گویا یہ سمجھا جائے گا کہ وہ اپنے حق سے دستبردار ہوگئے ہیں، اور اگر وہ اس کا انکار کر دے تو پھر مذکورہ تفصیل کے مطابق زمین کی تقسیم ہوگی، واللہ اعلم۔

زندگی میں اولاد کے درمیان جائیداد کی تقسیم

سوال:- کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ میں کہ: اگر والد اپنی حیات میں اپنے مال کو اپنی اولاد میں تقسیم کرنا چاہتا ہے،تو اس کی کیا ترتیب ہے؟ شرعی حکم سے آگاہ فرمائیں۔(ایک سائل، احمد آباد)

الجواب و باللہ التوفیق:-

1- باپ حین حیات تنہا اپنی جائداد واملاک کا مالک ہوتا ہے، اس لئے وہ حسبِ منشاء مناسب تصرف کرنے کا مجاز ہوتا ہے، اولاد کا حق متعلق نہیں ہوتا ہے، اس لئے اسے مطالبہ کا حق نہیں ہوتا ہے۔

2- بہتر یہ ہے کہ باپ اپنی زندگی میں جائیداد واملاک تقسیم نہ کرے، ان کے انتقال کے بعد وارثین شرعی ہدایات کے مطابق تقسیم کرلیں گے، اگر آئندہ اختلاف کا اندیشہ ہوتو باپ زندگی میں متوقع وارثین کا حصہ متعین کردے، اوراولاد سے عہد لے لے کہ آئندہ وہ اس تعیین وتقسیم کے مطابق عمل کریں گے۔

3- ان سب کے باوجود اگر باپ اپنی زندگی میں مال وجائیداد تقسیم کرنا ہی چاہے تو اس کی گنجائش ہے، زندگی میں تقسیم کرکے دینا ہبہ اور گفٹ کہلاتا ہے نہ کہ تقسیم میراث، اور زندگی میں اولاد کو ہبہ کرتے ہوئے عدل ضروری ہے، جیسا کہ نعمان بن بشیرؓ کی روایت میں ہے :

> (ایک دن) ان کے والد (حضرت بشیر رضی اللہ عنہ) انھیں رسول کریم ﷺ کی خدمت میں لائے اور عرض کیا کہ میں نے اپنے اس بیٹے کو ایک غلام ہدیہ کیا ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: کیا آپ نے اپنے سب بیٹوں کو اسی طرح ایک ایک غلام دیا ہے؟ انھوں نے کہا: ''نہیں'' آپ ﷺ نے فرمایا: تو پھر (نعمان سے بھی) اس غلام کو واپس لے لو، ایک اور روایت میں آتا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ سے ڈرواور اپنی اولاد کے درمیان انصاف کرو۔(۱)

عدل کے پس منظر میں یہ بات بہتر ہے کہ لڑکے اورلڑکی کو برابر دے، جیسا کہ امام ابو یوسفؒ کی رائے ہے؛ تاہم اگر لڑکی کو لڑکے کے مقابلہ آدھا دیا جائے تو یہ صورت بھی عدل کے خلاف نہیں ہے جیسا کہ امام محمدؒ کا قول ہے؛ لہٰذا صورت مسئولہ میں باپ کو دونوں باتوں کا اختیار ہے، کہ یا تو لڑکے اورلڑکیوں کو برابر دے یا لڑکی کو لڑکے کے مقابلہ آدھا دے :

> يعطى البنت كالابن عند الثانى وعليه الفتوى ، اى على قول ابى يوسف من ان التنصيف بين الذكر والانثى افضل من التثليث الذى هو قول محمد ۔ (۲)

(۱) مشکوۃ المصابیح:261۔ (۲) ردالمحتار:4/513۔

4- زندگی میں خود باپ اور اس کی بیوی کا حصہ متعین نہیں ہے، اس لئے باپ اپنی اور بیوی کی متوقع ضرورت کو ملحوظ رکھتے ہوئے مناسب مال اپنے لئے رکھ لے، پھر باقی مال کو اولاد کے درمیان تقسیم کردے، تاہم اگر بیوی کے لئے حصہ میراث کی طرح پورے مال کا آٹھواں حصہ اور اپنے لئے پورے مال کا چھٹا حصہ رکھنا چاہے اور باقی مال کو اولاد کے درمیان (لڑکی کے لئے سنگل حصہ اور لڑکا کے لئے ڈبل حصہ کے اعتبار سے) تقسیم کرنا چاہے تو اس کی بھی گنجائش ہے۔

5- کوئی بیٹا یا بیٹی زیادہ غریب ہو یا زیادہ خدمت گذار ہو یا کوئی اور معقول وجہ ہو تو اسے قدرے زیادہ دینا باعث گناہ نہیں ہے، تاہم قصداً کسی کو بالکلیہ محروم کردینا جائز نہیں ہے۔

6- زندگی میں اولاد کو مال دیتے ہوئے انھیں مالکانہ حقوق دے دیئے جائیں، یعنی ان کے قبضہ وتصرف میں دے دیا جائے؛ تاکہ ہبہ مکمل ہوجائے۔

• • •

شمارہ نمبر: ۱۲۵-۱۲۶، جولائی - دسمبر ۲۰۲۱ء

آڈیٹوریم اور مستقل لائبریری کا نقشہ، جس کا کام شروع ہو چکا ہے

المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد کی مجوزہ لائبریری و دارالتربیۃ (آڈیٹوریم) کی خوبصورت اور دیدہ زیب عمارت جس کی تعمیر اللہ کے فضل و کرم اور اصحابِ خیر کے تعاون سے شروع ہو چکی ہے

زیرِ تعمیر آڈیٹوریم اور مستقل لائبریری کی بنیادوں کا کام شروع ہو چکا

RNI No: 1219775, RNI Tile-Code: APURD01946

Al- Alam Urdu Computers Hyd. +91 9959897621